شاہ حُسین

لوک ورثہ

شاہ حسین

شفقت تنویر مرزا

لوک ورثہ اشاعت گھر
اسلام آباد

ترتیب

حرفِ عجز 5

ا۔ نام حسین اور ذات جولاہا 22

والدین

لاہور ..... یہ نگر سوبار لوٹا گیا

حسین کا شہر

مکتب اور استاد

تعلیم اور اندازِ تعلیم

ب۔ پیرومرشد 67

بہلول

داتا کا دربار

شیخ سعداللہ

ج۔ آغاز ملامت 97

دُلا بھٹی، علی کوتوال

مُلا عبداللہ سلطان پوری

اکبر بادشاہ

د۔ ہم عصر بزرگ، دوست، پیر بھائی ۱۲۹

ابو اسحٰق قادری، داؤد شیر گڑھی، شیخ حسو تیلی

موسے اکھو کھر، شیخ ارزانی، مادھو لال،،

مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی، خان خاناں، جوگی

معتقد اور ہم مجلس

ہ۔ سفر ۱۹۷

شاعر

لاہور سے باہر

جب حکم حضوری آپہنچا

مزارِ حسین

و۔ کرامات ۲۲۱

مدینہ اور لاہور، دردِ لادوا، مالِ دنیا

بوسہ، آدھی رات کا سورج، بارانِ رحمت

اولاد، جلال و جمال ۔

حرفِ عجز

مولانا ابوالکلام آزاد نے سرمد شہید کے سوانح اور رباعیات کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"عہدِ عالمگیری اور اس کے بعد جس قدر فارسی تذکرے لکھے گئے ان میں بالعموم سرمد کے عنوان سے چند سطریں ملتی ہیں لیکن اول تو قدیم تذکروں کے حالات اس قدر مختصر اور ناکافی ہوتے ہیں کہ اگر ان کی زندگی میں ان کے نام خطوط لکھے جاتے تو لفافہ کے لئے پورا پتہ میسر آتا...... میں نے عہدِ عالمگیری کی تاریخوں کو دیکھا کہ شاید حوادث و واقعات کے ضمن میں کچھ حالات مل جائیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پولیٹیکل ناعاقبت اندیشوں نے قلم کو روک لیا تھا...... میں نے ۱۰۷۰ھ کے حالات کی ورق گردانی کی کہ یہی سرمد کی شہادت کا سن ہے مگر حالات کا ملنا ایک طرف معلوم ہوتا ہے کہ پوری مستعدی کے ساتھ تار کے صفحوں کو بچایا گیا ہے کہ اس شہیدِ عشق کے جامۂ خونچکاں کی قطرہ افشانی سے حاشیہ پر کہیں دھبے نہ پڑ جائیں...... خافی خان کی "منتخب اللباب" عہدِ مغلیہ کی مشہور ترین تاریخ ہے جس میں اورنگ زیب کے حالات اس تفصیل سے لکھے ہیں گویا صرف یہی زمانہ موضوعِ کتاب ہے اسے کھولا تو ہزار صفحے کے سوانح میں ایک لفظ بھی سرمد کی نسبت نہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا رازِ مورخ کا قلم ہے۔"

شاہ حسین کا انجام اگرچہ سرمد ایسا نہیں ہوا مگر جو راہ انہوں نے اختیار کی وہ پہلے کسی نے نہ کی تھی اسی لئے ان کے ایک چھوٹے ہم عصر حضرت طاہر بندگی نے جو وحدت الشہود کے سلسلۂ تصوف کے

نامور پیش رو حضرت مجدد الف ثانی کے مرید تھے شاہ حسین کی وفات کے بہت عرصہ بعد کہا۔

"مرا اگر مظان طعنہ علماء نبودے اکثر بر گورِ شیخ حسین مے رفتم واستمداد از ارواحِ وے مے جُستم"

(معارج الولائت از عبداللہ خویشگی)

یعنی اگر مجھے علماء کے طعنوں کا خدشہ نہ ہوتا تو میں اکثر شیخ حسین کے مزار پہ جاتا اور ان کی روح سے راہ نمائی حاصل کرتا۔

شیخ محمد طاہر بندگی غایت درجہ پابندِ شریعت نقشبندی مجددی عالم وصوفی تھے، لاہور میں اپنے عہد کے بہت بڑے استاد بھی تھے، عزت وعظمت بہت، شہر میں وقار بہت، چاہتے تو اپنے زور پر حسین کے مزار پہ جا سکتے تھے اور شاید ان پہ ہاتھ ڈالنے والا کوئی نہ ہوتا مگر علماء کے طعنوں کے خوف سے حسین سے استمداد کی خواہش کو دل میں دبا کر ۱۰۴۰ھ یعنی حسین کی موت کے بتیس برس بعد انتقال کر گئے۔ حالانکہ عبداللہ خویشگی قصوری نے ہی لکھا ہے "حسین نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں تمام "امورِ نامشروعہ" سے توبہ کر لی تھی"

حسین کی زندگی میں ان "امورِ نامشروعہ" کے باعث یوں لگتا ہے کہ اپنے عہد میں سرکاری وغیر سرکاری تحریروں میں ان کا نام شجرِ ممنوعہ بن گیا تھا۔ ان "امورِ نامشروعہ" کے علاوہ شاید شاہ حسین کی کچھ حرکات ایسی بھی تھیں جو انہیں معاشرہ میں واجب الاحترام مقام دلانے میں حائل تھیں۔ مثلاً

(۱) حسین کا تعلق ان راجپوتوں سے تھا جنہوں نے اسلام تو قبول کر لیا تھا مگر ان کا حکم الگ ہی میں درجہ بہت بلند تھا اس لئے ان سے پہلے اور ان کے بعد زیادہ تر مسلم صوفیا انہی تین مسلمان قوموں میں سے ہوئے۔ جبکہ شاہ حسین کے مرشد بہلول دریائی بھی چنیوٹ کے جاٹ یا راجپوت تھے اور ان کے استاد شیخ سعد اللہ بھی ملتان کے نومسلموں میں سے تھے۔

(ب) حسین معاشی اعتبار سے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جسے آج بھی ورکنگ کلاس کہا جاتا ہے بلکہ ورکنگ کلاس سے بھی نیچے کمین طبقہ۔ جو آج بھی بہت مقہور ہے۔ چار سو برس پہلے تو اس کی

حالت اور بھی دگرگوں تھی۔

(ج) شاہ حسین نے پڑھ لکھ کر اپنے "ہونے کو جس طرح ڈبو دیا۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں اس کا رواج نہ تھا۔ ملامتی انداز عرب و فارس میں موجود اور رائج تھا، برصغیر میں بھی اثرات موجود تھے مگر جو انداز حسین نے اختیار کیا اور چھپ چھپا کر نہیں سرِعام بلکہ سربازار کیا وہ اس سے پہلے کسی کا وطیرہ نہ تھا یوں حسین نے ایک انتہائی خطرناک طرح نو ڈالی جس پر وہ خود ہی حرفِ آخر ثابت ہوگئے۔

(د) حسین کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے والے بھی زیادہ تر مقامی لوگ تھے جن کی حکومتوں سے وفاداریاں اگر مشکوک نہ تھیں تو یقینی بھی تصور نہیں کی جا سکتیں۔ جس نوعیت کا یہ حلقہ تھا اس میں عین ممکن ہے کہ حکومتِ وقت کے دُلّا بھٹی ایسے باغی بھی بار پاتے ہوں اور جس طرح دُلّا بھٹی کا قصہ شاہ حسین کے حوالے سے آشکار ہوا اس سے بخوبی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سیاسی اعتبار سے آزاد خیال لوگوں کو بھی حسین سے عقیدت تھی یا تعلق تھا۔

(ہ) حسین نے آخری عمر میں ہی سہی مگر برہمن مادھو کو جس طور اپنے روحانی وجود کا حصہ بنا لیا تھا اور اسے اپنے مذہب سے برگشتہ کر دیا تھا اس کے بعد غیرمسلم عالم فاضل اور مؤرخ لوگوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ حسین کے ساتھ انصاف کریں گے کارِ بیکار ہوگا۔

ان وجوہات کی بنا پر اگر یہ کہا جائے کہ حسین کو ان کے ہم عصر مؤرخوں، صوفیوں اور عالموں نے بالارادہ نظرانداز کیا تو بے جا نہ ہوگا۔ جہاں کہیں حسین کا ذکر آیا ہے عموماً مقامی لوگوں کے ساتھ آیا ہے۔ ان کے عہد میں شاہ ابوالمعالی بھی تھے اور حضرت موجِ دریا بھی، حضرت میاں میر تھے اور حضرت مجدد الف ثانی بھی۔ شاہ جمال بھی اور شاہ کمال بھی مگر حسین کا ذکر چنیوٹ کے جاٹ بہلول دریائی، قصور کے شیخ صدو، لاہور کے حسو تیلی اور شیخ موسے لکھو کے ساتھ آیا ہے۔

شاہ حسین کے عہد میں جو تقریباً پورے کا پورا اکبر کا عہد کہلاتا ہے، عبدالقادر بدایونی، ابوالفضل نظام الدین احمد ہروی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ سربرآوردہ عالم، ادیب اور مؤرخ شمار ہوتے ہیں۔ مگر ان کے ہاں شاہ حسین کا کوئی ذکر اذکار نہیں ملتا۔ ملا عبدالقادر بدایونی

نے تاریخ سے ہٹ کر مذہب اور تصوف پر نظام الدین احمد ہروی کے اوراق کو ترتیب دے کر "نجات الرشید" کے نام سے ایک کتاب لکھی مگر اسے صدیوں تک چھاپہ خانہ کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا ۱۹۷۲ء میں لاہور سے چھپی۔ اس میں شاہ حسین کا ذکر اس طرح سے ہے کہ شیخ حسین کپڑا بنا کرتے، کام چھوڑا، فقراء میں شامل ہو گئے، گانا سنتے ہوئے گرے اور جاں بحق ہو گئے، ...... مذہب اور تصوف کی اس کتاب میں حسین کا ذکر اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے تاہم اس سے یہ ثابت ہوا کہ حسین نے مُلا عبدالقادر یا نظام الدین احمد کے زمانے میں دوسرے لفظوں میں اکبر کے عہد میں فقر یا تصوف کے حوالے سے نام پیدا کر لیا تھا۔

شاہ حسین کی غیر معمولی زندگی کے باعث جہانگیر کے متاثر ہونے کا ذکر ہے مگر جہانگیر نے خود اس کا کہیں ذکر نہیں کیا اور نہ ہی جہانگیر کے عہد کی کتابوں میں کہیں ایسا ذکر اب تک سامنے آیا ہے روایت یہی ہے کہ جہانگیر نے عالم شہزادگی میں حسین کے پاس حاضری دی۔ روزنامہ مساوات لاہور اور بعد میں مجلس شاہ حسین نے حسین کے مجموعہ کلام کے سرورق پر حسین اور جہانگیر کی تصویر بھی چھاپی ہے جو اس اعتبار سے قابلِ اعتماد نہیں کہ اس میں حسین کو باریش پیر کی صورت میں دکھایا گیا حالانکہ اس وقت جہانگیر کی اتنی عمر نہ تھی۔ دوسرے شاہ حسین نے جو ہلچل مچائی وہ تو داڑھی منڈوانے اور سربازار "رقص" سے آغاز ہوئی تھی اور جہانگیر نے بھی اسی عہد میں اس "دلچسپ آدمی" کا روزنامچہ تیار کرنے کی خواہش کی ہو گی۔ اور ان کی باتیں تحریر میں لانے کے لئے اپنے ایک کاتب بہار خان کو متعین کر دیا جس نے حسین کے فرمودات اور واقعات پر مشتمل "بہاریہ" نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ شاہ حسین کے ابتدائی تذکرہ نگاروں داراشکوہ اور محمد پیر نے اس کتاب کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ مگر نور احمد چشتی نے ۱۸۶۴ء میں جب تحقیقات چشتی لکھی تو بتایا کہ "بہاریہ" کا نام ضرور تھا دیکھی نہ تھی، جب کتاب (تحقیقات چشتی) لکھنا شروع کی تو انگریز حاکموں کی مہربانی سے "بہاریہ" (غالباً واحد نسخہ) ہاتھ آ گئی"۔ انہوں نے اس کی تلخیص یا اس سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا۔ مگر بعد میں وہ نسخہ غالباً انگریزوں نے واپس لے لیا۔ ایس ایم لطیف نے "ہسٹری آف لاہور" میں کچھ اس انداز سے "بہاریہ" کا ذکر کیا ہے جیسے انہوں نے یہ کتاب دیکھی تھی

اس سے زیادہ تفصیل بیان نہیں ہوئی۔ لاجونتی رام کرشن نے "پنجابی صوفی پوئٹس" میں لکھا کہ یورپ اور برطانیہ کے کتب خانوں میں بھی "بہاریہ" نام کی کتاب دستیاب نہیں ہوئی..... اب تک "اصل بہاریہ" کا سراغ نہیں مل سکا، اس طرح اس کے وجود کو خیالی بھی کہا جا سکتا ہے اور حقیقی بھی..... بہرطور حسین کے شب و روز کے بارے میں سب سے معتبر مصالحہ اسی کتاب میں ہو سکتا ہے۔

شاہ جہان کے عہد میں لکھی گئی کتابوں میں سے محمد صالح کنبوہ کی کتاب "عمل صالح یا شاہجہان نامہ" میں شاہ حسین کے مزار کا ذکر کچھ اس طرح کیا گیا ہے جیسے شاہ حسین بزرگ ہستی تھے اور ان کا مزار ایسا ہے کہ بادشاہ بھی اس کا احترام کرتا تھا۔ شاہ جہان خود حضرت میاں میر اور حضرت شاہ بلاول کے پاس حاضر ہوا مگر ایسے کسی حوالے سے بھی شاہ حسین کا ذکر نہیں آیا۔

دارا شکوہ نے ۱۰۴۹ھ میں "سفینۃ الاولیا" مکمل کی اس میں حضرت میاں میر سید داؤد کرمانی، وال (شیر گڑھ) ت شاہ ابو المعانی، احمد کابلی (مجدد الف ثانی)، اور شاہ بلاول کا ذکر ہے مگر شاہ حسین کا کوئی حوالہ نہیں۔ سکینۃ الاولیا (جو حضرت میاں میر کے بارے میں لکھی گئی) اس میں بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ کہیں حسین کا ذکر نہیں آیا۔ البتہ "حسنات العارفین" میں جو سوموار ۲۶ ربیع الاول ۱۰۶۴ھ کو مکمل ہوئی شاہ حسین کا نہ صرف ذکر موجود ہے بلکہ شیخ حسین ڈاہڑا کو "اہل ملامت" کا استاد لکھا گیا ہے۔ دارا شکوہ کے حوالے سے اکثر کتابوں میں منقول ہے کہ "اکبر اور جہانگیر کے حرم کی عورتیں شاہ حسین کی عقیدت مند تھیں" بہرطور دارا شکوہ، ملا عبدالقادر بدایونی کے معتبر ذریعہ ہے، جس نے شاہ حسین کی شخصیت کے بارے میں تھوڑا مگر جامع تذکرہ کیا..... "بہاریہ" کا حوالہ اس نے نہیں دیا۔

۱۰۶۴ھ تک مادھو لال کو انتقال کئے بارہ برس ہو گئے تھے، مگر دارا شکوہ نے شیخ حسین کے ضمن میں کسی طرح بھی مادھو کا ذکر نہیں کیا۔ گویا اس وقت تک حسین "شیخ حسین ڈاہڑہ" کے نام سے ہی معروف تھے۔

حسین کا تفصیلی تذکرہ ۱۱۰۷ھ میں شیخ محمود المعروف محمد پیر (جسے زیادہ تر پیر محمد لکھا گیا)، نے "حقیقت الفقراء" کے نام سے فارسی نظم میں لکھا۔ اس کتاب کا پہلی بار اردو میں ترجمہ ۱۹۲۳ء میں چھپا۔

جبکہ اصل کتاب مجلس شاہ حسین لاہور نے ۱۹۶۶ء میں چھپوائی جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ایک مخطوطہ پر مبنی ہے۔ حقیقت الفقراء کے مطابق جب شاہ حسین کی نعش کو شاہدرہ سے باغبانپورہ تک لایا گیا۔ اس وقت مصنف محمد پیر کی عمر تیرہ برس کی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاہ حسین کا انتقال جمادی الثانی کی آخری تاریخ ۱۰۰۸ھ اور رجب کی پہلی رات کو ہوا جبکہ محمد پیر کی پیدائش اٹھارہ انیس روز پہلے ہو چکی تھی۔ محمد پیر شاہ حسین کے ناطے مادھو لال کا مرید ہوا مگر کتاب مادھو لال کے مرنے کے پندرہ برس بعد لکھی جس وقت اس کی اپنی عمر تریسٹھ برس ہو چکی تھی۔

محمد پیر "بہاریہ" کا ذکر کیا ہے، نہ دارا شکوہ کی کتاب "حسنات العارفین" کا مگر حکمران خاندان کے بزرگوں اور امیروں کے بارے میں تفصیل سے باتیں لکھی ہیں جو اگر غلط ہوتیں تو ممکن ہے اس کی پکڑ دھکڑ ہوتی اور یہ کتاب دوسری کتابوں کی طرح تلف ہو جاتی ۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کتاب اورنگزیب عالمگیر کے زمانے میں لکھی گئی ۔ بلاشبہ یہ کتاب اعتقادی رنگ میں لکھی گئی ہے اور زیادہ زور کرامات پر دیا گیا ہے مگر بعض بنیادی معلومات اس کتاب میں موجود ہیں۔ کتاب لکھتے وقت حافظ کی مدد زیادہ لی گئی ہے۔ اس لیے بعض ضمنی واقعات میں تاریخی مطابقت مشکوک ہو جاتی ہے مگر اکثر واقعات کی تاریخ گواہی بھی دیتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگرچہ بابا بدھ سنگھ کا خیال ہے کہ چھجو بھگت نے سب سے پہلے حسین کو شاہ حسین (شیخ حسین سے مقامی باشندہ ہونا اور شاہ حسین سے غیر مقامی ہونا ثابت ہوتا ہے) کہہ کر پکارا تھا مگر حسین نے خود اپنی شاعری میں اپنے آپ کو شاہ حسین کہا ہے اس کے بعد محمد پیر نے حقیقت الفقراء میں حسین کو شاہ حسین ہی لکھا ہے۔

پروفیسر محمد اقبال مجددی کی تحقیق کے مطابق حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم کے مرید عبدالفتاح نے اپنی کتاب مفتاح العارفین (۱۰۸۰ھ) میں شیخ حسین کا ذکر کیا اور یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں حسین کو ہندی (پنجابی) زبان کا شاعر بتایا گیا ہے اور حسین کی ایک بہت ہی اہم کافی پنجابی میں ہی درج کی گئی ہے۔

قصور کے عبداللہ خویشگی (۱۱۰۶-۱۰۴۳ھ) نے اخبار الاولیاء (۱۰۷۷ھ کے بعد) اور معارج الولایت

۱۰۹۱ھ میں شاہ حسین کا ذکر کیا۔ طاہر بندگی کا قول اور حسین کا "غیر مشروع امور" سے توبہ کرنے کا حال خویشگی نے لکھا ہے جو خود طاہر بندگی کی وفات کے تین سال بعد پیدا ہوا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درباری منشی سوہن لال سوری نے عمدۃ التواریخ کی صورت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار کا روزنامچہ لکھا۔ اس میں شاہ حسین کا ذکر ہے کہ مہاراجہ ایک بار بیمار ہوا تو مزار پر حاضری دی۔ مزار پر غلاف چڑھایا۔ پھر دو میلوں کا بندوبست کیا، بسنت اور چراغاں..... مہاراجہ قلعہ سے دلی دروازے کے راستے مزار پر جایا کرتا تھا۔

نور احمد چشتی کو جب انگریز حکمرانوں نے لاہور شہر کے مزاروں، مساجد اور دوسری قدیم عمارتوں کے بارے میں کتاب لکھنے کے لئے کہا تو انہوں نے ۱۲۸۱-۱۸۶۴ھ میں ہزار صفحے پر مشتمل یہ کتاب لکھی اور اس میں شاہ حسین، مادھو لال، ان کے مریدوں کے سلسلہ اور مزار کی حالت کے بارے میں تفصیلات اکٹھی کیں اور "یادداشت" کے تحت لکھا "تمام حالات حضرت حسین کے اس کمترین نے کتاب حقیقت الفقراء مصنفہ حضرت پیر محمدؒ جو بزبان فارسی نظم میں ہے انہوں نے سن ۱۰۷۱ھ تصنیف فرمائی ہے اور نیز کتاب "بہاریہ" سے لی ہیں۔ سبحان اللہ کلام حضرت پیر محمد صاحب وبہار خان عجب صاحب تاثیر ہے۔ ... الحمد اللہ والمنت کہ بعد تلاش یہ حالات حسینی دستیاب ہوئے اور کتاب "بہاریہ" تو بدرجہ غایت ناپید ہے۔ سالہا سال سے بندہ کو شوق اس کی زیارت اور مطالعہ کا تھا مگر دستیابی اس کی نہایت دشوار تھی...... اب دم تصنیف کتاب تحقیقات چشتیہ باقبال سرکار عالی وقار گھر میں بیٹھے بٹھائے بسہولت تمام مل گئی اور فدوی نے خاطرخواہ مطالعہ کر کے حرف بحرف خلاصہ اس کا کر لیا۔"

نور احمد چشتی نے "بہاریہ" اور حقیقت الفقراء کے علاوہ مندکرہ بالا "معارج الولائت" سے بھی استفادہ کیا۔ انہوں نے بعض واقعات ایسے لکھے ہیں جن کا ذکر حقیقت الفقراء میں نہیں مگر ان کے ہاں بھی زیادہ تر وہی واقعات ہیں جو حقیقت الفقراء میں ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ محمد پیر نے بھی بہاریہ سے کسب فیض کیا ہے اور کچھ باتیں اس نے مادھو لال اور حسین کے دوسرے مریدوں

سے حاصل کی ہیں۔

چشتی کے ہاں شیخ حسو تیلی، شیخ موسے کھوکھر، جوگیوں سے مکالمہ، اکبر کے وزیر کا مرید ہونا وغیرہ واقعات اور مریدوں کی تفصیل حقیقت الفقراء سے حاصل نہیں کی گئی۔ نہ ہی چشتی نے ان کا منبع بتایا ہے، تاہم حقیقت الفقراء کے بعد چشتی کی تحریر بعض تاریخی تضادات (شیخ بہلول کو شاہ لطیف بری اور انہیں شاہ محمد مقیم کا مرید دکھانا) کے باوجود حسینی لٹریچر کے سلسلے میں انتہائی اہم ہے اور مفتی غلام سرور، محمد دین فوق اور دوسرے لوگوں نے اپنی تحریروں کی بنیاد چشتی کی کتاب کو بنایا ہے

شاہ حسین اور مادھو کے بارے میں آج بھی متعدد ایسی تحریریں سامنے آتی ہیں جن سے مزید الجھنیں پیدا ہونے کا محکم خدشہ ہے۔ مثلاً معروف تذکرہ نویس مولانا اعجاز الحق قدوسی نے تذکرہ صوفیائے پنجاب میں حسین اور مادھو کا الگ الگ حال لکھا اور مختلف باتیں گڈمڈ ہوئیں مگر حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ شاہ حسین کی شاعری مادھو کے نام سے منسوب کر دی گئی، اور شفیع عقیل نے شاہ حسین کی کافیوں کے جو ترجمے اردو شعر میں کئے ہیں وہی مادھولال والے باب میں ڈالے گئے۔

شاہ حسین کی زندگی اور کرامات سے ہٹ کر ان کی پنجابی شاعری کے بارے میں ایک زمانہ یہ بھی آن لگا تھا کہ وہ بالکل بھلا دی گئی، چنانچہ محمود شیرانی نے معروف کتاب "پنجاب میں اردو" لکھی (۱۹۲۸ء) تو اس میں شاہ حسین کی صرف ایک کافی کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی نقل نہیں کی گئی حالانکہ حسین کے بے شمار مصرعے ہو بہو اردو کا روپ ہیں اور اکبر کے عہد کی یہ شاعری حافظ صاحب کی بنیادی دلیل یا موقف کو باقی سب کے مقابلے میں زیادہ تقویت دے سکتی تھی۔

شاہ حسین کی پنجابی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے، جو حافظ محمود شیرانی کے ہم عصر تھے بڑی دل جمعی سے کام کیا اور پنجاب کی اس گم گشتہ دولت کو ڈھونڈ کر پنجابی زبان اور ادب پر بڑا احسان کیا۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے مکمل کام شاہ حسین لاہوری کے عنوان سے ۱۹۴۲ء میں اردو حروف میں کتاب چھاپی جس کا دیباچہ پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے لکھا...

ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں " دیوانہ نے کلام حسین کے ماخذ میں متعدد کتابوں کا ذکر کیا ہے لیکن ان میں

سے اصل اہمیت وہ ایک مجہول الاسم گورمکھی پستک کو دیتے ہیں جو کسی نامعلوم سندھی مولف نے تدوین کی اور جس میں ان کے قول کے مطابق شاہ حسین سمیت دو سو سینتالیس ہندو، سکھ، مسلمان فقیروں، صوفیوں اور جوگیوں کا کلام راگوں میں جمع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ لاہور میں طبع ہوئی۔ اس میں شاہ حسین کی ایک سو اڑتیس کافیاں شامل بتاتے ہیں۔ دوسرا درجہ بطور ماخذ وہ گورمکھی کی اس ہتھ پستک کو دیتے ہیں جو کہیں ۱۸۰۴ء میں لکھی گئی اور اب پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری میں بصورت خطی نسخہ ۲۴۳ محفوظ ہے۔ اس میں اکتالیس کافیاں ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس گمنام سندھی مدون کی بے نام کتاب سے ..... محروم دید رہے ہیں ..... تاہم اس نامعلوم الاسم کتاب کی بیان کردہ اکثر صفات سے متصف ایک بڑی ضخیم پستک ہم نے پٹیالہ یونیورسٹی کے پروفیسر پیارا سنگھ پدم کے پاس دیکھی اس کا نام "شبد شلوک بھگتاں دے" ہے اور اس میں شاہ حسین کی شاید سوا سو سے کچھ زیادہ کافیاں راگوں کی ترتیب میں درج ہیں۔ یہ پستک لاہور سے ۱۹۰۱ء میں چھپی تھی"۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کی دریافت پر ہی مجلس شاہ حسین، چوہدری افضل خان، ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر محمد آصف خان کے مرتب کردہ نسخے چل رہے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے نسخے میں ایسی کافیاں بھی شامل کی ہیں جو پہلے نسخوں میں نہیں اور یہ سامان انہوں نے مشرقی پنجاب کی نجی اور پبلک لائبریریوں سے اکٹھا کیا ہے۔ ان میں سے کچھ ایسی ہیں جن کے بارے میں واضح طور پر شک کیا جا سکتا ہے کہ یہ حسین کی نہیں ہو سکتیں تاہم ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھی ان میں کافیوں اور دوہڑوں کو فی الحال "خانۂ تصدیق طلب" میں رکھا ہے۔

شاہ حسین کی زبان کے بارے میں بھی کچھ شکوک کا اظہار زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے کیا گیا ہے جو پنجابی زبان کے خون خمیر سے بوجوہ آگاہ نہیں اور آگاہ ہو بھی نہیں سکتے کیونکہ نہ اس زبان کا ادب نہ یہ زبان پنجاب کے مکتبوں میں پڑھائی گئی نہ اسے ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد کہتے ہیں" حسین کی جم پل" اور سکونت آخر عمر تک لاہور کی تھی۔ اس لیے اس کے کلام میں ہمیں پنجابی کے

لاہوری تلفظ اور محاورے کی توقع ہونی چاہیئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے کلام کا کوئی متن بھی اس توقع کی تائید نہیں کرتا اور اس کے لب ولہجے پر راوی کے دوسری طرف بار، ملتان اور پوٹھوہار یعنی مغربی پنجاب یا لاہندے کا اثر غالب ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ آج سے چار سوا چار سو سال پہلے جب حسین شعر کہتا تھا راوی کے اس طرف لاہور کی بولی وہ تھی جو آج راوی کے دوسری طرف بولی جاتی ہے؟

اس سوال کا جواب تو صرف اتنا ہے کہ شاہ حسین سے بہت بعد کے شاعر ہاشم شاہ (امرتسر)، حامد شاہ عباسی (گورداسپور) اور مولوی غلام رسول (کپورتھلہ، ہوشیار پور) کی زبان بھی کم و بیش وہی ہے جو شاہ حسین کی ہے اور قصور کے بلھے شاہ کی زبان یا شیخوپورہ کے وارث شاہ کی زبان بھی کوئی زیادہ مختلف نہیں۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے کیفی جام پوری کی "سرائیکی شاعری" کے دیباچہ میں لکھا ہے

....."ملتانی کا لفظ سب سے پہلے آئین اکبری میں استعمال ہوا۔ ابوالفضل نے ہندوستان کی مختلف تیرہ زبانوں کا ذکر اس طرح کیا ہے ..... دہلوی، بنگالی، ملتانی، مارواڑی، گجراتی، تلنگی مرہٹی، کرناٹکی، سندھی، افغانی، شالی، بلوچستانی اور کشمیری"۔۔۔۔

موجودہ پنجاب کی ساری بولیوں کو ایک زمانے میں "ہندی" یا "ہندوی" کہا جاتا تھا، ملتان کے لہجے اور ذخیرہ الفاظ کے اشتراک کے باعث پورے پنجاب میں بولی جانے والی زبان کو ابوالفضل نے "ملتانی" لکھ دیا حالانکہ لاہور میں مسلسل پندرہ سال تک قیام کرنے کے سبب وہ یہاں کی زبان کو لاہوری لکھ سکتا تھا بشرطیکہ وہ "ملتانی" یا "ہندی" سے مختلف ہوتی۔ پھر اورنگ زیب کے عہد میں "مرزا صاحباں" والے حافظ برخوردار نے اپنی زبان کو "پنجابی" لکھا جو واقعتاً ہندی ہی ہے۔ گویا کیا جائے کہ پنجابی کی ساری کلاسیکل شاعری پنجابی کی لہندی بولی میں ہی ہوئی ہے اس لئے ہمیں شاہ حسین کی زبان کو بھی اس مخصوص زاویے سے دیکھنا چاہیئے۔۔۔ مزید تصدیق گریرسن کے سے ہو سکتی ہے جس کا خیال ہے کہ لہندی کسی زمانے میں سرستی تک پھیلی ہوئی تھی اور اب بھی پنجابی کی بنیاد لہندا ہی ہے۔ گریرسن تسلیم کرتا ہے کہ وہ پنجابی اور لہندا کے درمیان

حد فاصل کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نے محض اپنا جھوٹا نظریہ سچ ثابت کرنے کے لئے ایک مفروضہ حد فاصل کھینچی۔ یہ حد فاصل بھی بولی جانے والی زبان یا لہجوں کو ملحوظ رکھ کر قائم کی گئی اور پنجابی، لہندی، ملتانی، سرائیکی، ہندکو، ریاستی، ڈیرہ دری اور پہاڑی یا ڈوگری کے کلاسیکل لٹریچر کو پیش نظر نہیں رکھا گیا کیونکہ اس طرح گریئرسن کا نظریہ باطل ہو جاتا اور وہ جو سکھ پنجابی اور مسلم پنجابی کو دو الگ الگ زبانوں میں تقسیم کرنے کا بیج بونا چاہتا تھا وہ نہ بویا جا سکتا۔ لاہور سے دریائے راوی کے ساتھ ساتھ دونوں کناروں پر اگر دس میل تک جائیں تو دونوں کناروں پر بولی جانے والی پنجابی گریئرسن کے چھ سات سو صفحے پر پھیلے موقف کی تردید کرنے میں ایک پل بھی نہیں لیتی۔ پورے پنجاب کے لوک گیتوں کی زبان بھی بولیوں کو الگ الگ زبان کی حیثیت دینے کی اجازت نہیں دیتی۔ اگر گریئرسن مشرقی لندن اور مغربی لندن میں بولی جانے والی انگریزی کی بولیوں کو الگ الگ زبانیں قرار دیتا تو پھر اس کی "لہندا پنجابی لڑاؤ" منطق قبول کی جا سکتی تھی۔ گریئرسن کے اپنے الفاظ میں:

> "....an old form of Lahnda must once have extended right up to the Sarasvati and that it is still the foundation of Panjabi. ....It is quite impossible to point to any boundary line or approximate boundary line between the two forms (Panjabi and Lahnda of speech....I have been guided mainly by the vocabulary"—
>
> Linguistic Survey of Pakistan
> Vol. III—P 608

مختصراً یہ کہ گریئرسن اس پوزیشن میں بھی نہیں کہ پنجابی اور لہندا جسے آج کل سرائیکی بھی کہا

جاتا ہے، کے درمیان کوئی حد فاصل یا مفروضہ حد فاصل کھینچ سکے۔ دوسری طرف وہ پنجابی کی بنیاد لہندا کو بتاتا ہے اور پھر ان کو الگ الگ زبانیں بنانے پر پوری ایک جلد صرف کرنے کے بعد بھی اتنی سی بات کہتا ہے کہ میں نے یہ موقف محض ذخیرۂ الفاظ کی بنا پر اختیار کیا ہے۔

پنجابی زبان کی بولیوں کو اس طرح الجھانے اور کسی بولی کو آزاد زبان قرار دینے کا یہ عمل اور اس پر اصرار انگریزوں نے ہی شروع کیا تھا جس پر ایک اور عالم اور پنجابی کے معروف محقق ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ (جو پوٹھوہار کے رہنے والے تھے) نے بھی ناراضگی کا ہلکا سا اظہار کیا ہے۔

"Modern Panjabi may be said to commence with the 19th century when through European influence Multani was taken away from under Panjabi and the phunetics and vocabulary of Ludhiana and its neighbouring districts were sought to be imposed upon the public as the nucleus for a standard literary Panjabi." But the effort failed from the very nature of the genius of the language and the peop'e whose hetrogene-ous composition dictated a different programme.

A History of Panjabi Literature
1100 to 1932. P. 8.

شاہ حسین کی زبان کے حوالے سے ہی یہ بات بتانا بھی ضروری ہے کہ ان کے ہم عصر لوگ شاعری میں کس انداز کی زبان استعمال کیا کرتے تھے۔ یہاں گورکھ ناتھ، چرپٹ ناتھ، بابا فرید، دمودر وغیرہ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ لاہور اور لاہور کے آس پاس کے بابا نانک اور چھجو بھگت کے کچھ مصرعے دیئے جاتے ہیں جن کے الفاظ سے گریئرسن کے اس موقف کا بطلان بھی ہوتا ہے کہ پنجابی اور لہندا الگ الگ زبانیں ہیں اور اس بات کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ ان دونوں میں

حدِ فاصل کھینچی ہی نہیں جا سکتی۔

نانک :۔ چارے کنڈاں ڈھونڈیاں کو نیمھ ہمیہنڈا
جے تدھ بھاوے صاحبا توں میں ہوں تیہنڈا
گورتے در گھر جانیئے سو جائیے رسنجانے
نانک نام نہ وسرے ساچے من مانے

چھجو بھگت :۔ سرونیں سین کہانیاں جے گور تھیوے کرپال
جس ڈِٹھے من دھیری اے کل وکھ دکھن دور
پنج پیسے تیری گتھلی ترے مٹھے دوئے کھوٹے
چھجو کھوٹا ونج کریندیاں نت ٹوٹا او ٹوٹ
چھجو تہاں بجتر سیج دا کوئے نہ لگم بان
چھجو جے من رکھیں تکرٹا تاں پھیرا نہ ہوسی آوت
گالھیں وات نہ جوگیا پیریں جوگ نہ بندھ

متذکرہ بالا مصرعوں میں خط کشیدہ الفاظ (فعل، اسم، دونوں) ایسے ہیں جو لدھیانوی پنجابی علاقے میں کم ہی بولے جاتے ہیں۔ لاہور میں بھی ان کا منہ زبانی استعمال کم ہے مگر یہ سارے الفاظ لہندا، ملتانی اور سرائیکی اور پوٹھوہاری اور ہندکو میں عام بولے بھی جاتے ہیں جبکہ پنجابی کی ساری کلاسیکل شاعری سے لے کر آج تک ان کا شعری اور ادبی استعمال ہوتا رہا ہے ۔۔۔۔۔۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ پنجاب میں پنجابی نہ پڑھائی گئی نہ سرکاری طور پر استعمال ہوئی، ادبی حیثیت سے اسے سو سال سے بالکل ہی پس پشت ڈال دیا گیا ہے اس لئے زبان اور اس کی بولیوں کے بارے میں خود اہلِ پنجاب شدید قسم کے خلفشار کا شکار ہو رہے ہیں۔ پنجاب والوں کو مسلمانوں کے عہد سے لے کر اب تک کسی بھی زبان کی صرف ایک مستند اور معیاری شکل دکھائی گئی ۔۔۔۔۔

عربی، فارسی، انگریزی اور اردو۔۔۔۔۔اس لئے وہ اسی قسم کے یکساں معیار کو عام بول چال میں بھی ڈھونڈتے ہیں، اور چونکہ اپنا ادب اور شاعری پڑھی نہیں اس لئے لہجوں کے اختلاف کے باعث پیدا ہونے والے مخمصوں سے نکل ہی نہیں سکتے۔ انہیں یہ بھی اندازہ نہیں کہ کتابی اردو سے ہٹ کر دہلی، لکھنؤ، گورکھپور، میرٹھ، پٹنہ، الہ آباد، فیض آباد اور ان کے نواح میں اُردو کے کیسے کیسے لہجے ہیں۔

جہاں تک عالموں کا معاملہ ہے امیر خسرو (۱۳۲۵-۱۲۵۳) نے پنجابی کو لاہوری بھی کہا ہے اور لہندی بھی (نو سپہر، سندر داس اپ : ۱۵۶۶ء) نے غالباً سب سے پہلے اسے 'پنجابی' کہا ہے۔ (پنجابی ادب دی مختصر تاریخ۔ دیوان) ابوالفضل نے اسے ملتانی لکھا ہے۔ محسن فانی نے ۱۰۵۵ھ میں دبستانِ مذاہب میں بابا نانک کی زبان کو "زبانِ جٹانِ پنجاب" لکھا ہے۔ حامد عباسی نے اپنی سیر (۱۷۰۳ء) میں اسے "جٹکی" کہا ہے۔ انشا نے دریائے لطافت میں لہندی، وسطی پنجابی یا سکھی پنجابی اور مشرقی پنجابی کے لئے لفظ 'پنجابی' استعمال کیا ہے۔

اس ضمن میں حافظ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں لکھا ہے۔۔۔۔۔ "ملک پنجاب کی زبان آج کل پنجابی کے نام سے موسوم ہے۔ امیر خسرو اس کو لاہوری کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ابوالفضل ملتانی کہتا ہے۔ مغربی مؤرخین نے شمالاً و جنوباً ایک خط کھینچ کر مشرقی و مغربی پنجابی میں اسے تقسیم کر دیا ہے۔ مشرقی حصہ کی زبان کا نام پنجابی رکھا ہے اور مغربی حصہ کی زبان کا نام لہندا۔ پنجابی کو مغربی ہندی میں شامل کرتے ہیں اور لہندی کو بیرونی دائرہ میں داخل کر کے سندھی اور کشمیری کا رشتہ دار مانتے ہیں۔ اہل پنجاب یہ فرق تسلیم نہیں کرتے ان کا بیان ہے کہ پنجابی اور لہندا ایک ہی زبان ہے۔ مغربی اور مشرقی زبان میں جو فرق ہے وہ اصولی نہیں ہے بلکہ تدریجی اور ضلع ضلع کی مقامی خصوصیات کی بنا پر ہوتا چلا گیا ہے اور یہ تقسیم ہر حال میں ناجائز ہے۔

پنجاب اگرچہ پانچ دریاؤں کا ملک ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ صوبہ کی زبان انہی دریاؤں کے درمیان محصور ہے بلکہ وہ ان دریاؤں سے چھلک کر دونوں طرف پھیل گئی ہے ادھر

دریائے گھگھر تک آگئی ہے، ادھر دریائے سندھ پار کر گئی ہے"۔۔۔۔۔

شاہ حسین کی زبان کے بارے میں کسی قسم کی جھجک کے بغیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس عہد میں لاہور سمیت پورے پنجاب کی زبان تھی اور بعد میں بھی شاعری کی حد تک بالکل معمولی فرق کے ساتھ پشاور سے شملہ تک اور جموں سیالکوٹ سے صادق آباد تک اسی ملتانی لہجے یا سرائیکی لہجے کو معیاری تصور کیا گیا۔ انگریزوں نے مشرقی لہجے کو بقول ڈاکٹر موہن سنگھ اُوبرائے دیوانہ کی جو کوشش کی وہ شاعری کی حد تک ناکام ہو گئی۔ یہ شاعری یا زبان تعلیمی اداروں میں نہیں پڑھائی جاتی۔ جہاں مختلف لہجوں میں وہی انضمام ہو سکتا ہے جو شاعری میں موجود ہے البتہ سکھوں کی طرف سے پنجابی کو مذہبی زبان قرار دینے کے بعد سکھوں نے نثر میں جو کچھ لکھا اس پر وسطی پنجابی لہجے کی چھاپ ہے۔ چونکہ پنجابی نثر لکھنے کا آغاز وسطی پنجاب میں ہوا اس لئے اس علاقے سے وابستہ مسلمان نثر نگاروں نے وسطی لہجے اور روپ کو محفوظ رکھا یوں ایک ہلکا سا فرق اس لئے پیدا ہوا کہ ان نثر نگاروں میں سے کسی نے بھی سبقاً سبقاً (تعلیمی اداروں میں) پنجابی زبان اور ادب پڑھا ہی نہ تھا۔

یوں شاہ حسین کو شاعری کے حوالے سے جانچنے، پرکھنے اور ان کے بارے میں قدیم تاریخی کتابوں اور مخطوطوں سے جو مواد اکٹھا ہو سکتا تھا وہ بھی اب تک نہ ہو سکا۔ اسی طرح جب ہم صوفی شاہ حسین کی زندگی کے ساتھ ساتھ شاعر شاہ حسین کی زندگی کے بارے میں مواد کی تلاش میں نکلتے ہیں تو سب راستے بند نظر آتے ہیں اگرچہ اس پہلو پر تھوڑا بہت کام ہوا بھی ہے تو وہ اس صدی کی ساتویں دہائی کے شروع سے ہوا جب مجلس شاہ حسین نے حسین کے بارے میں ثقافتی سطح پر کچھ پیش رفت کی۔

صوفی اور شاعر سے علاوہ شاہ حسین کی ایک اور حیثیت بھی متعین کرنے والی ہے اور وہ یہ کہ انہیں موسیقی سے کس حد تک ربط تھا۔ کیا انہوں نے کلاسیکل موسیقی میں کوئی مقام پیدا کیا تھا؟

حقیقت الفقراء میں لکھا ہے:

ہر کہ از ہندو و مسلماں بود   از دل و جانش از محبان بود

نیز برسر بخاک درگاہش   تان سین افتادہ در راہش

تان سین گوالیاری کا انتقال ۷۹۹ھ ـ ۱۵۸۸ء میں ہوا۔ گویا تان سین نے دربار اکبری سے وابستگی کے بعد بہت سے سال لاہور میں ہی گزارے ہوں گے اور یہ بعید از امکان نہیں کہ تان سین اور شاہ حسین میں موسیقی بھی ایک مشترک قدر بن گئی ہو۔

دوسرا ثبوت یہ ہے کہ شاہ حسین کی کافیوں کے ساتھ راگوں اور راگنیوں کے نام بھی لکھے ملتے ہیں حتیٰ کہ ایک کافی پر صرف "خیال" لکھا ہوا ہے جس کی ایجاد کا سہرا سلطان حسین شرقی کے سر باندھا جاتا ہے مگر اس کو مقبولیت آخری مغل حکمرانوں (خصوصاً محمد شاہ) کے عہد میں حاصل ہوئی۔

مولانا عبدالمجید سالک نے شاہد احمد دہلوی کے حوالے سے "مسلم ثقافت .... ہندوستان میں" لکھا ہے کہ "خیال" کا چراغ تین سو سال تک دھرپد کے آگے نہ جل سکا"۔ ... گویا ان تین سو سال کے درمیان میں شاہ حسین کو "خیال" کا خیال رہا اور یہی بات یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ حسین کا کلاسیکی موسیقی سے ایک طرح کا تخلیقی تعلق تھا۔ انھوں نے اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کے لیے شاعری موسیقی اور عوامی زبان کا سہارا لیا۔ ... اور تینوں صورتوں کے ساتھ رقص و مستی کی چوتھی صورت شامل کر دی۔ ... اس عہد میں رقص کے فنی پہلوؤں کے اعتبار سے شاہ حسین کے رقص کی کیا حیثیت متعین کی جا سکتی ہے؟ صاحبان فن نے فی الحال حسین کی زندگی کے اس پہلو کو بھی تشنۂ بیان رکھا ہے ... بہر طور شاہ کے پنجابی کلام میں ان فنون کا حوالہ ملتا ہے

اساں کت کو شیخ کہاونا، گھر بیٹھیاں منگل گاونا

درگاہ وچ سہاگن سوائی جو کھل کھل نچ کھلوئی

ان کے طریق عبادت میں شاعری، موسیقی اور رقص کو خاص اہمیت حاصل ہے، عثمان ہارونی کی روایت "سر بازار مے رقصم" کو بھی انھوں نے نبھایا۔ غرض کہ پہلودار شخصیت اور پہلودار عہد مگر شخصیت کے ان پہلوؤں کے بارے میں ریکارڈ "تقریباً" ندارد۔

وحید احمد مسعود نے خواجہ معین الدین چشتی کے سوانح لکھتے ہوئے اپنی مشکلات کا ذکر

یوں کیا تھا "یہ واقعہ ہے کہ مقربین، معتقدین اور معاصرین حضرت غریب نواز جیسی عظیم اور عظیم انقلاب پیدا کرنے والی شاندار اور یگانۂ روزگار ہستی کی نہ خاطر خواہ سوانح عمری لکھ سکے۔ اور نہ ان کی تعلیم کی وضاحت کر سکے۔ ..... حق یہ ہے کہ ایسی لطیف شخصیتیں ظاہری قیود سے بالاتر ہوا کرتی ہیں، اسم و رسم کھو دینے والوں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ .... ہمیں جو معلومات میسر ہیں وہ نہ معلوم ہونے کے برابر ہیں اور وہ بھی اختلافات و اضداد سے بھری ہوئی ہیں ..... یہ تذکرے جو لکھے گئے ہیں گنتی کے چند حالات، چند کرامات اور چند ارشادات پر مشتمل ہیں۔ حالات کی بے ربطی شخصیت پر سے نقاب نہیں اُلٹ سکتی۔ کرامات، توہمات کی حدود میں پہنچ جاتے ہیں۔ .... اور صاحب کرامت کی علویت کو ثابت نہیں کرتے۔ .... یہ تذکرے گویا از قسم داستان ہیں۔ .... مجھے اپنی اس کوشش میں پرانی بنیادوں پر نئی عمارت بنانے میں قیاسات سے کام لینا پڑا ہے وہ قیاسات حدود کے اندر ہیں۔ .... ممکن ہے میری اس کوشش کی اشاعت کے بعد مردے از غیب بیروں آید و کارے بکند اور اپنی وسیع معلومات سے حضرت غریب نواز کا ایسا تذکرہ لکھ سکے جس پر بجا طور پر تذکرہ یا سوانح عمری کا اطلاق ہو؟ ...

سرمد شہید کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد اور خواجہ معین الدین چشتی کے بارے میں وحید احمد مسعود کی متذکرہ بالا تحریروں میں ان سب مراحل، نارسائیوں اور کوتاہیوں کی بالواسطہ نشاندہی ہو گئی ہے جو شاہ حسین کے حالات لکھتے وقت ہمیں درپیش تھیں یا سرزد ہوئیں لیکن ایک امید زیادہ روشن ہو گئی ہے کہ کبھی نہ کبھی، کوئی نہ کوئی مسیحا ایسا بھی آ سکتا ہے جو یہ نہ کہے کہ "تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر دامن میں سجائے بیٹھے ہو" بلکہ کچھ ایسا کام کر گزرے جس پر اسے خود بھی ناز ہو کہ ؎

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

نام حسین اور ذات جولاہا

آباؤ اجداد اور قبول اسلام

والدین

لاہور.... یہ نگر سو بار لوٹا گیا

حسین کا شہر

مکتب اور استاد

تعلیم اور اندازِ تعلیم

حسین ۹۴۵ھ میں لاہور شہر کے محلہ تلگجھ یا تل بھوگا (حالیہ ٹیکسالی موہنی روڈ وغیرہ) میں ایک نومسلم گھرانے میں پیدا ہوئے، تاریخ پیدائش پر کسی کو اختلاف نہیں اور یہ تاریخ پیدائش شیخ محمود عرف محمد پیر نے شاہ حسین کے بارے میں فارسی زبان میں لکھے گئے تذکرہ (۱۰۱۷ھ) میں تحریر کی ہے؛ اسی تذکرے میں لکھی گئی ان باتوں پر بھی کسی کو اختلاف نہیں کہ ان کے آباؤ اجداد ہندو تھے جو فیروز شاہ کے عہد (   ) میں مسلمان ہوئے، پڑھے لکھے ہونے کی بنا پر انہیں شیخ کہا جانے لگا۔ ان کے خانوادے کو بنی اسرائیلی بھی کہا جاتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ حسین والدہ اور والد دونوں کی طرف سے راجپوت تھے۔ ماں باپ نے ان کا نام حسین رکھا۔ والد شیخ عثمان کے حوالے سے شیخ حسین کہا جانے لگا والدین   رزق کمانے کے لیے کپڑا بنا کرتا تھے۔ ان دنوں لاہور شہر کپڑے کی صنعت کے باعث بہت دور دور تک معروف تھا۔ ۔ ۔ شیخ حسین کی والدہ ڈاہڈا یا ڈھڈی راجپوتوں میں سے تھیں اس لیے اگلے مرحلے پر شیخ حسین، حسین ڈاہڈا کے نام سے معروف ہوئے اور دارا شکوہ نے بھی انہیں حسین ڈاہڈا ہی لکھا، دارا شکوہ نے ان کی جلالی کیفیت کے باعث غالباً ڈاہڈا کو سخت مزاج کے طور پہ نام کا حصہ بتایا۔ ۔ ۔ ۔ خود حسین نے اپنی شاعری میں اپنے آپ کو حسین اور شاہ حسین کے نام سے پکارا ہے۔ حسین جولاہا یا بافندہ کے طور پہ ملا عبدالقادر بدایونی نے کتاب نجات الرشید میں یاد کیا ہے۔ یہ کتاب شاہ حسین کی زندگی میں ہی ۱۰۰۴ھ کے آس پاس

مکمل ہوئی تھی۔

نام کے اعتبار سے حسین پہلے مرحلے پر شیخ حسین، پھر حسین جولاہا، پھر حسین ڈاہڈا اور آخر میں شاہ حسین کے نام سے پہچانے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر مرنے کے بڑے عرصہ کے بعد ان کا نام مادھولال حسین ہو گیا اور انیسویں صدی سے وہ اسی نام سے معروف ہیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی، داراشکوہ، محمد پیر اور عبد الفتاح بن محمد لقمان بدخشی، دسویں اور گیارہویں ہجری کے ان تذکرہ نویسوں میں سے کسی نے شاہ حسین کو مادھولال حسین نہیں لکھا۔ شاہجہان ؒ کے محمد صالح کنبوہ نے بھی صرف شیخ حسین ڈاہڈا لکھا ہے ۔

حسین کے آباؤ اجداد کے پیشے کے بارے میں تاریخ خاموش ہے لیکن ان کے والد اور خود ان کے بارے میں لکھا گیا کہ وہ کپڑا بُنا کرتے تھے اور یوں گزر اوقات کیا کرتے تھے حسین نے اپنے جولاہا ہونے کا ذکر بغیر کسی خِفت کے کیا ہے۔

انی حسینو جولاہا

ناؤں حسین تے ذات جولاہا گالی دیندیاں تانی والیاں

ان کے بعد آنے والے پنجابی کے ایک اور معروف شاعر فرد فقیر نے ۱۱۶۳ھ میں کسب نامہ بافندگان میں ایک شعر کے ذریعے دو عظیم جولاہوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

پر ایس کسبے وچ بہتے عالم فاضل ہوئے
شاہ حسین کبیر جہے آہے درگاہ جا کھلوئے

(جامہ بافی کے کسب میں بڑے بڑے عالم فاضل ہوئے ہیں مگر ان میں سے شاہ حسین اور کبیر وہ عظیم لوگ تھے جو خدا تک جا پہنچے تھے)

عبد اللہ خویشگی قصوری کی کتاب "معارج الولایت" میں لکھا گیا ہے کہ "در عرف ڈھڈہ بود ڈھڈہ صنفے از جولاہگان است"۔ ۔ یعنی ڈھڈہ جولاہوں کی ایک گوت ہے۔

محمد پیر نے لکھا ہے اور بعد میں سبھی نے اسے مصدقہ سمجھتے ہوئے نقل کیا ہے کہ شاہ حسین

کو محلہ کی مسجد میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ اس مسجد میں حافظ ابوبکر بگھوی امامت کراتے تھے اور بچوں کو پڑھاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ٹکسالی دروازے کے باہر والی وہی مسجد ہے جس کے ایک حجرے میں پنجابی کے معروف شاعر استاد دامن رہا کرتے تھے اور جو ۱۹۸۵ء میں مرنے کے بعد باغبانپورہ میں شاہ حسین کے مزار کے احاطے میں ہی دفن کئے گئے۔

دس سال کی عمر میں شاہ حسین نے سات سیپارے حفظ کر لئے تھے۔ انہی دنوں (۹۵۵ھ) میں شیخ بہلول دریائی بلادِ اسلامیہ کا چکر کاٹنے کے بعد گزرے ہوئے بزرگوں کی ہدایت پر لاہور شہر میں وارد ہوئے اور حسین کی تلاش میں تل بھوگا کی مسجد میں پہنچ گئے، جہاں انہوں نے لڑکے کو دیکھا، اس کا احوال حافظ ابوبکر سے دریافت کیا اور پھر اسی مسجد یا اس کے نواح میں ڈیرہ جما لیا۔ انہوں نے حسین پر توجہ دینا شروع کی۔ ان دنوں دریائے راوی شاہی قلعے کے بالکل قریب سے بہتا تھا اور ٹکسالی کی یہ مسجد بھی ایک طرح سے لبِ دریا تھی۔ جس روز شیخ بہلول اس مسجد میں آئے انہوں نے حافظ ابوبکر سے اجازت لے کر حسین کو وضو کے لئے دریا سے پانی لانے کو کہا، حسین پانی لائے، شیخ بہلول کا وضو کرایا جس کے بعد شیخ نے دُعا کی۔

کرد بروے دُعا کہ بارِ خُدا
سازد او را ز زمرۂ فقراء

کہ حسین کو فقراء کے زمرہ میں شامل فرما دے۔

شیخ بہلول کے آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی رمضان کا مہینہ آ گیا۔ شیخ نے حافظ سے پوچھا کہ مسجد میں تراویح کون پڑھاتا ہے؟ حافظ صاحب نے اپنا بتایا تو شیخ نے کہا کہ اب کے رمضان میں دس سالہ حسین تراویح پڑھائے گا۔۔۔۔۔ حافظ صاحب نے حیرت کا اظہار کیا کہ اس نے تو صرف سات سیپارے حفظ کئے ہیں تیس سیپارے کیسے سنائے گا۔۔۔۔۔ شیخ بہلول نے اس کی ذمہ داری لے لی اور یکم رمضان کو حسین نے تراویح پڑھانا شروع کیں۔۔۔۔۔ ظاہر ہے دس سال کے بچے کا تراویح پڑھانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ سارے علاقے میں حیرت کی لہر دوڑ گئی۔

اور سب اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں ساتویں رمضان کے بعد کیا ہوتا ہے۔ خود حسین بھی اس عجیب و غریب آزمائش میں پڑ کر پریشان ہو گئے اور جب روز انہوں نے ساتواں سیپارہ ختم کیا شیخ بہلول سے پوچھا اب کیا ہوگا۔

شیخ بہلول نے حسین سے کہا کہ وہ ان کے وضو کے لیے بھر دریا سے کوزے میں پانی لائیں اور یہ بھی بتایا کہ انہیں دریا پر ایک بزرگ ملیں گے جنہوں نے سبز کپڑے پہن رکھے ہوں گے، یہ بزرگ جو کچھ کہیں حسین اسی طرح کریں۔ یہی ہوا، جب حسین کوزہ بھر کر دریا سے مڑے تو عین سامنے ایک سبز پوش بزرگ نکلے ان کے بالوں میں نورانی سفیدی تھی، چہرے پر بشاشت اور نرمی تھی۔ انہوں نے خود حسین کو سلام کیا اور کہا کہ وہ خضر ہیں، انہیں حق نے بھیجا ہے، حسین کو ہر علم سے آشنا کر دیا اور ظاہر و باطن کے ہر علم کا ماہر بنا دیا جائے۔ انہوں نے حسین سے کہا کہ کوزہ میں سے پانی ان کی اوک میں ڈالے تاکہ یہ پانی حسین کے منہ میں ٹپکایا جائے۔ حسین نے جب یہ باتیں سنیں تو سر بزرگ کے قدموں پر رکھ دیا... خضر نے حسین کا سر ہاتھوں میں لے کر اوپر اٹھایا۔ حسین نے پانی خضر کے ہاتھ پر ڈالا جو انہوں نے حسین کے حلقوم میں ٹپکا دیا۔ حسین کو دعا دی اور کہا اپنے شیخ سے میرا سلام کہنا۔ اس کے بعد خضر غائب ہو گئے اور حسین واپس اپنے شیخ کے پاس آئے۔ پانی کے چند قطروں سے حسین کے اندر ایک نئی وسیع و عریض دنیا نے جنم لیا، ایک نور کا دریا تھا۔ تا حدِ نظر پھیلا آئینہ تھا جس میں ہر علم اور ہر عالم نظر آ رہا تھا۔

شیخ بہلول نے حسین سے سارا قصہ سنا تو کہا کہ اس سارے واقعے کو اگر ساری عمر ایک راز رکھ سکو تو اسی صورت میں اس سے فیض اٹھا سکو گے۔

دیدی از قدرت خدا کہ چناں
خضر خواناند مر ترا قرآں
پیشوا باش ہاں بہ نیت پاک
ہم قرآں بہار خواں بے باک

آٹھویں رمضان سے ستائیسویں رمضان تک حسین نے سب سے والنّاس تک پورا قرآن تراویح میں ختم کر کے نمازیوں کو حیران و ششدر کر دیا۔ اسے شیخ بہلول کا فیض سمجھا گیا یا حسین پر اللہ تعالےٰ کی خاص عنایت لیکن یہ بات یہ کرشمہ پورے شہر میں پھیل گیا۔۔۔۔۔ حسین کو ودیعت کی گئی عظمت کی طرف یہ پہلا زینہ تھا۔ اس کے بعد شیخ بہلول نے حسین کی تعلیم و تربیت پر مزید توجہ دی اور کم و بیش مزید بارہ برس تک شیخ بہلول لاہور میں مقیم رہے۔

حقیقت الفقراء کے مطابق جب حسین کی پہلے مرحلے کی تربیت اور تعلیم شیخ بہلول مکمل کر چکے تو انہوں نے حسین کو داتا گنج بخش علی ہجویری کی روحانی سرپرستی میں دے دیا۔ اس وقت حسین کی عمر بیس بائیس برس کے درمیان ہو گی۔ حسین کو جو کچھ ودیعت ہوا تھا اس کے بارے میں کمال رازداری کا حکم بھی دیا گیا تھا اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ شہر کے تمام عالموں، فاضلوں اور خدا رسیدہ بزرگوں سے گہرا تعلق رکھیں اور پڑھائی بھی جاری رکھیں۔ شیخ بہلول اپنے وطن چنیوٹ (چند لیوٹ) سے سات میل مشرق کی طرف واقع اپنے گاؤں بہلول چلے گئے جہاں سے انہوں نے مکہ مدینہ کا سفر اختیار کیا تھا اور واپسی پر حسین کے لئے لاہور میں مقیم ہو گئے تھے۔

شاہ حسین نے بارہ برس حضرت علی ہجویری کے مزار پر عبادت کی، راوی دریا کے اندر اور کنارے پر بیٹھ کر ریاضت کی۔ ہر روز ایک قرآن پاک ختم کیا اور شہر کے شہرہ آفاق اساتذہ کے پاس حاضری دی۔ غالباً انہی دنوں انہوں نے سید داؤد کرمانی (شیر گڑھ)، حضرت ابو اسحاق قادری، حضرت بایزید دیا پوری اور شیخ سعد اللہ کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ شیخ سعد اللہ بنی اسرائیلی سے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔

داراشکوہ اور محمد پیر کی روایت کے مطابق حسین شیخ سعد اللہ کے پاس تفسیر مدارک پڑھ رہے تھے کہ آیت قرآنی وما حیوٰۃ الدنیا الا لہو ولعب آئی اس کی تفسیر پر استاد اور شاگرد میں مکالمہ ہو گیا۔ حسین کا اصرار تھا کہ عمل کے بغیر دنیاوی زندگی کھیل تماشے اور رامش و رنگ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

حسین کے بارے میں داراشکوہ نے لکھا ہے کہ قرآن کی آیات کی عجیب وغریب تاویلیں کرتا تھا۔ سو شاہ حسین نے عجیب وغریب تاویل اس آیت کی بھی کی اور چھتیس برس (۹۸۱ھ) کی عمر میں اپنے لئے اسی "مقدر ساز" لمحے میں ملامت کا راستہ منتخب کر لیا۔

حسین نے مدرسہ کے اندر ہی رقص شروع کیا اور مدرسے سے رقص کناں کتاب بدست باہر آگئے، یہ ایسا حیران کن واقعہ تھا کہ ان کے ساتھی شاگرد بھی انگشت بدنداں انہیں دیکھتے پیچھے پیچھے آئے۔ ان کے غصے اور حیرت کی انتہا نہ رہی جب حسین نے کتاب تفسیر مدارک ایک کنوئیں میں پھینک دی اور اپنے رقص کو تیز کر دیا۔

ساتھی طالب علموں کو حسین کے علم وفضل کا بخوبی علم تھا، حسین کی شہرت پورے شہر میں تھی کہ ایک نیا عالم اُبھر رہا ہے جو اس شہر کو علم کے نور سے اور روشن کر دے گا۔ مگر یکایک یہ انہونی اَن سوچی واردات سب کو ہکا بکا کر گئی۔ حسین کے ساتھیوں نے حسین پر تفسیر کی بے حرمتی کا الزام لگایا جس پر حسین نے کہا "دوستو، مجھے بُرا بھلا کیوں کہتے ہو، مجھے گالی کیوں دیتے ہو، میں تو کتاب کی منزل سے گزر چکا، اس لئے میں نے یہ کتاب کنوئیں میں ڈال دی، مجھے اب اس کی کوئی ضرورت نہیں لیکن اگر تمہیں یہ کتاب درکار ہے تو میں ابھی اس کا بندوبست کئے دیتا ہوں" یہ کہہ کر حسین نے قرآن ہی کی آیت پڑھی اور کتاب کنوئیں سے خود بخود باہر آگئی۔ حقیقت الفقراء میں لکھا ہے

بدر آمد ز چاہ آں تفسیر — ورقے تر نہ بود ازاں تفسیر
ہمہ حیراں شدند زیں برہاں — ایں باآں آں بایں شدہ نگراں
مے بگفتند ہمہ گر کہ عجب — تر نشد ایں کتاب از چہ سبب

دس سال کی عمر میں بغیر پڑھے پورا قرآن کریم تراویح میں سنانے کے بعد تفسیر مدارک کو کنوئیں میں سے نکالنے اور مدرسہ سے اس انداز سے قطع تعلق کرنے کے واقعات نے حسین کے بارے میں شہر میں طرح طرح کے افسانوں کو جنم دینا شروع کیا ..... مگر معاملہ یہاں پر ہی ختم نہیں ہوا:

حسین نے مدرسے اور خانقاہ سے نکل کر عالموں اور طالب علموں والا جُبّہ و عمامہ ترک کیا۔ سُرخ لباس پہن لیا۔ داڑھی مونچھ منڈوا دی، اور شراب، رقص اور سرود سے لو لگالی۔

ہم تراشید ریش را پس زاں جام بر کف گرفت چوں رنداں
ساقی و مطرب و شراب و رباب - - - - - - - - - - - -
آمد از صومعہ بہ مے خانہ شد ز عقلِ معاش دیوانہ

اب حسین دن بھر بیانگِ دہل ناچتے گاتے پھرتے، ایک طائفہ ان کے ساتھ ہو گیا۔ مگر رات کے وقت وہی حسین راوی کے پانی میں کھڑے پورا قرآن ختم کر دیتے

دل و جاں بست در ولائے خُدا شد ملامت گزیں برائے خُدا

حسین کے اس حال سے شہر میں ہلچل مچ گئی اور قانون بھی حرکت میں آ گیا اور لوگوں کی زبانیں بھی بے لگام ہو گئیں۔ کسی نے کہا علم کا بوجھ نہیں اٹھا سکا، کم ظرف نکلا، کوئی بولا وہ تو حسب نسب سے ہی ہندو ہے کہ اس کے بڑے ہندو سے مسلمان ضرور ہوئے تھے مگر دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ کسی کے لب پہ تھا کہ چھوٹی ذات کا جولاہا تھا، علم کی دولت نجیب الطرفین کو راس آتی ہے اور کوئی گویا ہوا کہ وہ الٹے راستہ پہ پڑ گیا۔ شیخ بہلول کو خبر ملی تو وہ بسرعت لاہور پہنچے اور سرِ راہ ناچتے گاتے حسین سے ملاقات ہو گئی۔

چشم بکشاد و دیدیش از شفقت گفت الحمد للّٰہ از فرحت
خوش و خرم بخاطرِ خوشنود بخدائش سپرد و شد بدرود
دیدا ورا چوں باخدا آباد بوطن باز رفت با دلِ شاد

شیخ بہلول حسین کی حالت پر خوش ہوئے، اللہ کا شکر ادا کیا، حسین کو خُدا کے سپرد کیا اور خود خنداں و شاداں اپنے وطن کو روانہ ہو گئے گویا ان کی محنت کا ثمرا نہیں مل گیا۔

انہی دنوں ملکی حالات کی بنا پہ اکبر بادشاہ نے نہ صرف لاہور کو دوبارہ آبادی اور رونق بخشی، قلعے کی ازسرِ نو تعمیر کرائی بلکہ مستقلاً لاہور کو دار الحکومت بنا لیا، تمام امرائے سلطنت،

دانشورانِ سربلند، علماء اور صوفی شہر میں آگئے۔ اس شہر میں حسین جیسے فقیر کی غلط اندازی نے اس عہد کی شرع اور حکومت کو لرزانا شروع کر دیا۔

۹۸۱ - ۸۲ ھ میں اکبر کے شیخ الاسلام مُلّا عبداللہ سلطان پوری نے حسین کا حال سُنا تو دارا شکوہ کے بقول حسین کو سزا دینے کا اعلان کر دیا۔ شاہ حسین نے یہ سُن کر خود جارحانہ انداز میں شیخ الاسلام کو سرِ راہ روک لیا اور سرِعام ثابت کر دیا کہ جتنا گناہ گار حسین ہے خود شیخ الاسلام اس سے زیادہ گناہ گار ہیں۔

ابھی اس مرحلے سے گزرے ہی تھے کہ اکبر بادشاہ کو خبر ملی کہ فقیر حسین اہلِ ملامت کا استاد بنا پھرتا ہے۔ شہر کے کوتوال ملک علی سے کہا حسین کو پابجولاں پیش کیا جائے، انہی دنوں اکبر کے باغی دُلا بھٹی کو سرِعام پھانسی دینے کا حکم ہوا، حسین کوتوال کے قابو میں تو نہ آئے مگر بھٹی کی پھانسی کے موقع پر خود رقصاں و مستاں اپنے جھرمٹ کے ساتھ کے میدان میں پہنچ گئے۔ کوتوال نے گستاخی کی اور کہا کہ شرع کی پامالی پر حسین کو اذیت دے کر قتل کرے گا۔ حسین نے بددعا دی اور دُلّا بھٹی کو پھانسی چڑھانے کے بعد خود علی کوتوال کا وہی انجام ہوا جو وہ حسین کا کرنا چاہتا تھا۔

بہرطور شاہ حسین کو اکبر کے دربار میں پیش کیا گیا جہاں حسین نے کرشماتی صفائی پیش کر دی اور اکبر کے امراء میں سے ابوالفضل، عبدالرحیم خان خاناں، خانِ اعظم تان سین اور باقی نامور لوگ بھی حسین کی عظمت کے قائل نہیں ہوئے اکبر کے تینوں بیٹے سلیم، دانیال اور مراد کے علاوہ حرم کی خواتین بھی ان کی عقیدت مند ہوگئیں۔ دارا شکوہ نے اس حقیقت کا اعتراف کیا۔ اکبر کے پاس طلبی کے بعد شاہ حسین نے اکبر سے صرف ایک بات کہی کہ آئندہ اسے دربار میں طلب نہ کیا جائے نہ درباری امراء یا اہل کاران کے تعاقب میں بھیجے جائیں کیونکہ فقراء کا درباروں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا...... اکبر نے جس کی پیرپرستی کا کوئی مغل بادشاہ مقابلہ نہیں کر سکتا تھا چاہا کہ حسین کو اسی طرح نوازے جس طرح حضرت موج دریا اور دوسرے بے شمار بزرگوں کو نوازا تھا

مگر حسین کو یہ بھی منظور نہ تھا کیونکہ ان کا دین ایمان ہی کچھ اور تھا۔

کیں دے گھوڑے، ہستی، مندر، کیں دا ہے دھن مال
کہاں گئے مُلّا، کہاں گئے قاضی، کہاں گئے کٹک ہزار
ایہہ دنیا دن دوئے پیارے ہر دم نال سمھال
کہے حسین فقیر سائیں دا، جھوٹھا سب بیوپار

(کس کے گھوڑے، کیسی ہستی کون سے مندر اور دھن مال کا مالک کون رہا۔ مُلّا، قاضی اور لاکھوں لشکر کہاں گئے۔۔۔۔ پیارے دنیا صرف دو دن کی ہے ان میں بس خدا کو یاد رکھ، حسین کہتا ہے اس کے سوا باقی سب کاروبار جھوٹا ہے)

قاضیوں، ملاؤں اور حاکموں کے احتساب سے حسین نے رہائی پائی تو پھر اب اور طرح کی آزادی کا احساس ہوا۔

قاضی جانے، حاکم جانے نہ اتھے فارغ خطی وگاردی

یعنی حسین کی حقیقت اور حیثیت کا حاکموں کو بھی علم ہو گیا، قاضی بھی جان گئے اس لئے نہ اکبر کے دربار میں طلب کئے جانے کا خدشہ رہا نہ شیخ الاسلام کے جبر و قہر کا خوف باقی رہا اور حسین نے شہر کے اندر اور شہر کے باہر اجاڑوں، جنگلوں اور دشت میں اور ہی انداز میں خدا کو پانے کا سامان کیا۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی، دارا شکوہ اور محمد پیر کے علاوہ ۱۰۷۰ھ کے آس پاس حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم سرہندی کے مرید عبدالفتاح بن محمد لقمان بدخشی نے مفتاح العارفین میں لکھا:

شیخ حسین دبدہا لاہوری عالم بود و حال بہ کمال داشت از مجاذیب وقت وصاحب جوش وخروش بود ناگاہ جذبۂ الٰہی در رسیدہ۔ در کوچہ و بازار ریش تراشیدہ ومست وقوالان ہمراہ گرفتہ و شراب گور چری بر ملا نوشیدے پائے کوباں ورقص کناں مے رفتے اگرچہ در ظاہر شرع شریف مخالفت داشت امّا علما یان مشائخ باوے سر نیازے داشتند وکرامات از وئے

مزار پر جا کر استمداد کرتا؟"

محمد اقبال مجددی نے عبداللہ خویشگی قصوری کی معارج الولایت (۱۰۹۶ھ) کے حوالے سے لکھا ہے۔

اس (حقیقت الفقراء) کے مطالعہ سے شاہ حسین ایک غیر مشروع مجذوب نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی کے تین دور تھے۔ طالب علمی کا زمانہ، غیر مشروع اس سے توبہ کر کے دوبارہ صوم و صلوٰۃ کی پابندی"۔

محمد اقبال مجددی نے شاہ حسین کو تصوف پر فارسی زبان میں لکھے ایک رسالہ تہنیت، کا مصنف بھی بتایا ہے جو مجددی صاحب اعظم گڑھ کے رسالہ معارف اگست ۱۹۷۰ء اور "صحیفہ" لاہور جولائی ۱۹۷۲ء میں چھاپ چکے ہیں۔ شاہ حسین کی پنجابی شاعری کی بالواسطہ تصدیق داراشکوہ نے کی اور براہِ راست ان کے شاعر ہونے کا اعتراف عبدالفتاح نے کیا۔ ان کی فارسی شاعری کا ذکر نور احمد چشتی نے کیا مگر ان کی کسی نثری تصنیف کا پہلی بار ذکر اور موجودگی کا اعلان اقبال مجددی نے ۱۹۷۰ء میں کیا۔ تاہم شاہ حسین خود کہتے ہیں۔

اوتھے ہور نہ کائے قبول، گل نیونہہ دی

اک لائے بھبھوت بہن لائے تاڑی، اک ننگے پھردے وتج اجاڑیں
کوئی درد نہ چھاتی تینہہ دی

اک راتیں جاگن ذکر کریندے، اک سڑدے پھردے بھکھ مریندے
جائے نہیں اوتھے کہیں دی

اک پڑھدے نی حرف قرآناں، اک مُلّے کر دے نال زباناں،
ایہہ گل نہ ہاسے ہینہہ دی

اس کی درگاہ میں عشق کے علاوہ اور کوئی بات قبول نہیں۔
اک جسم پر بھبھوت لگائے ٹکٹکی باندھ کر اسے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

دوسرے لباس سے بے نیاز جنگل اجاڑ میں آوارہ ہیں، مگر ان کے سینے سوز سے خالی ہیں۔
ایک وہ ہیں جو ساری ساری رات جاگ کر اس کا ذکر کرتے ہیں۔
دوسرے بھوکے پیاسے مارے مارے پھرتے ہیں۔ مگر وہاں یہ مشقت بھی قبول نہیں۔
ایک صرف قرآن پڑھتے رہتے ہیں، دوسرے ہمہ وقت مسئلے بیان کرتے رہتے ہیں۔
مگر عشق کی بات کوئی ٹھٹھہ مذاق ہے؟

اور اپنے بارے میں حسین کا کہنا ہے

اک شاہ حسین فقیر ہے، تُسیں نہ آکھو پیر ہے
اساں کوڑی گل نہ بھاوندی

شاہ حسین تو صرف ایک فقیر ہے اسے آپ پیر کیوں کہتے ہیں
ہمیں یہ جھوٹ اچھا نہیں لگتا۔

والدین

محمد پیر حقیقت الفقراء میں شاہ حسین کے والدین کے بارے میں تفصیل یوں بتاتا ہے۔

آمد آں بحرِ عشق راگوہر　　دو تا در طرف از سوئے مادر
ورنہ در اصل آنچہ معتبر است　　کلسرا عرفش از سوئے پدر است
کلسرائے رہِ ثبوت نسب　　ہست از قوم راجپوت لقب
بود ایں قوم اولاً کافر　　از خدا و رسول او منکر
مے نویسم ہر آنچہ دارم یاد　　کہ ازیں قوم بود مرد آزاد
بود آں مرد کلسرائے بنام　　یافت از حق سعادتِ اسلام
شد مسلمان روئے صدق و یقیں　　آمد از راہ کفر در رہِ دیں
شاہ فیروز ختم پادشہاں　　شیخ دارش خطاب در اقراں
ہست نامش حسین بن عثمان

شاہ حسین کا اپنا نام حسین اور ان کے والد کا نام عثمان تھا حسین کی والدہ کا تعلق ڈھڈی / ڈاہڈا راجپوتوں سے تھا جبکہ شیخ عثمان بھی راجپوت تھا مگر اس کے خاندان کا عرف کلسرائے تھا۔ حسین باپ کے خاندانی عرف کی بجائے دستور کے خلاف ماں کے خاندان کے عرف سے مشہور ہوتے یا

ان کے مزاج اور طور اطوار کے باعث انہیں ڈاڈھا کہا جانے لگا۔ شاہ حسین کے ددھیال کے بارے میں جو کلسرائے تھے کہا گیا ہے وہ فیروز شاہ کے عہد میں مسلمان ہوئے۔ مغلوں سے پہلے تین بادشاہ فیروز شاہ کے نام سے جانے جاتے تھے۔ اولاً رکن الدین فیروز شاہ ۶۳۳-۳۴ ھ، ۱۲۳۶ء۔ اس کا تعلق خاندانِ غلاماں سے تھا۔ دوسرا جلال الدین خلجی فیروز شاہ (۶۸۹ - ۶۹۵ھ ۱۲۸۹ - ۱۲۹۵ء) اور تیسرا فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ - ۷۹۰ھ ۱۳۵۱ - ۱۳۸۸ء) ــــــ پہلے دو بادشاہوں کا لقب فیروز شاہ تھا جبکہ تیسرے کا نام ہی فیروز شاہ تھا۔ تیسرے یعنی فیروز شاہ تغلق نے خود ایک بار پنجاب کا دورہ کیا اور وہ بھی صرف دیپالپور تک۔ البتہ فیروز شاہ کی ماں مشرقی پنجاب کے شہر ابوہر کے راجہ رانا مل بھٹی کی بیٹی تھی۔

رکن الدین فیروز شاہ شمس الدین التمش کا نالائق بیٹا تھا جس کے بارے میں مختصراً اقبال صلاح الدین (تاریخ پنجاب) نے لکھا ہے: "زندگی کے آخری ایام میں امراء نے التمش سے جانشینی کے مسئلے پر بات کی تو اس نے جواب دیا کہ اس کی اولاد میں سوائے اس کی بیٹی رضیہ کے کوئی بھی اس بارِ گراں کا متحمل نہیں ہو سکتا لیکن امرا نے ایک خاتون کو سربراہ تسلیم کرنے سے عذر کیا۔ التمش کی وفات کے بعد امراء نے اس کے لڑکے رکن الدین فیروز شاہ کو بادشاہ بنا دیا۔ رکن الدین صرف نام کا بادشاہ تھا اصل اقتدار اس کی ماں شاہ ترکان کے ہاتھ میں تھا۔ تخت نشین ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد اس نے امور سلطنت سے قطعاً لاپرواہی اختیار کر کے اپنے آپ کو رنگ رلیوں میں مبتلا کر لیا۔ رکن الدین فیروز شاہ علماء اور دانش مندوں کی بجائے مسخروں اور بہروپیوں کی صحبت کو ترجیح دیتا تھا اس کی ہوس کاریوں نے اکثر امراء کو اس سے بدظن کر دیا۔ دور نزدیک کے بہت سے علاقے مرکز سے علیحدہ ہو گئے۔ شاہ ترکان نے اپنی چالاکی کی بدولت اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ اس نے سازش سے التمش کے چھوٹے بیٹے قطب الدین کو قتل کرا دیا لیکن رضیہ اس کی سازش کا شکار ہونے سے بال بال بچ گئی۔ بالآخر سات ماہ کی دگرگوں حکومت کے بعد فیروز شاہ اور اس کی ماں عوام

اور خود اس کے غیظ و غضب کا نشانہ بن کر تخت و تاج کے علاوہ اس دُنیا سے بھی رخصت ہوئے:۔

رکن الدین فیروز شاہ کے بارے میں ان چند سطور سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ حسین کے بزرگ کم از کم اس کے عہد میں مسلمان نہیں ہوئے ہوں گے اور نہ ہی اس فیروز شاہ کے بارے میں محمد پیر یہ کہہ سکتا ہے کہ

شاہ فیروز ختم پادشہاں

ساتویں صدی ہجری یا تیرھویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ پنجاب کے اکثر قبائل نے انہی دنوں اسلام قبول کیا۔ ملتان، اوچ اور لاہور کے علماء اور صوفیا کے علاوہ اس عہد میں سب سے نمایاں حیثیت پاک پتن کے بابا فرید الدین مسعود گنج شکر (۶۶۴-۵۸۳ھ) کی ہے۔ اگر ایک طرف بابا فرید الدین سے نظام الدین اولیاء ایسے بزرگوں نے کسب فیض کیا تو دوسری طرف جھنگ، سرگودھا، اٹک سے لے کر بہاول پور، راجستھان اور حصار اور کرنال تک کے بیشمار راجپوت قبائل نے بابا فرید کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا۔ ان قبائل میں سیال، کھرل، بھٹی اور وٹو بھی شامل ہیں۔ چنانچہ قرائن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ بھٹی اور دوسرے راجپوت قبیلے بابا فرید کے عہد اور اس کے بعد بڑی تیزی سے مسلمان ہوئے۔ بابا فرید نے لاہور میں بھی قیام کیا اور داتا گنج بخش کے مزار پر چلّہ کاٹا۔

یہی عہد جلال الدین خلجی فیروز شاہ کا ہے یعنی جلال الدین کو اگرچہ حکومت بہت بعد میں ملی مگر بابا فرید کی وفات کے وقت وہ جوان تھا اور خواجہ نظام الدین اولیاء اس کے قریبی ہم عصر تھے۔ امیر خسرو اس کے دربار سے وابستہ تھے جس کی تفصیل ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں موجود ہے۔۔۔۔ جلال الدین خلجی فیروز سلطان غیاث الدین بلبن کا امیر تھا اور اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ کسی دن ہندوستان کا بادشاہ بن جائے گا۔ اس لئے جب اسے بادشاہ بنایا گیا تو اس نے انکساری اور عاجزی کے تحت دہلی میں رہنے سے انکار کر دیا اور ملحقہ علاقے کیلوکھری کے محل میں رہنے لگا، اور اسی کو دارالحکومت قرار دیا اور

نام شہر نور رکھا۔ امیر خسرو نے اسی شہر کا ذکر اپنے ایک قصیدے میں کیا ہے۔

شہا در شہر نو کردی حصارے
کہ رفت از کنگرۂ او تا قمر سنگ

(اے بادشاہ تو نے شہر نو میں ایسا حصار تیار کیا ہے کہ جس کے کنگروں سے پتھر پھینکیں تو چاند کو جا لگتا ہے)

ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ جلال الدین فیروز شاہ کی تخت نشینی کے دوسرے سال سلطان غیاث الدین بلبن کے بھتیجے ملک چھجو نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور دہلی کی طرف لشکر کشی کی۔ بدایوں کے قریب فیروز شاہ کی فوج سے مقابلہ ہوا، ملک چھجو کی فوج پسپا ہو گئی، جو امرا قید ہوئے ان کے بارے میں امیر خسرو نے بیان کیا کہ ان کی گردنوں میں دوشاخے لٹکے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ اونٹوں پر سوار تھے۔ سر اور چہرے پر لشکر کی گرد جمی ہوئی تھی اس حالت میں سلطان (فیروز شاہ) کے پاس لائے گئے۔ اس نے رومال آنکھوں پر رکھ کر بلند آواز سے کہا "یہ کیا ہے؟" اور اسی وقت حکم صادر ہوا کہ امرا و معارف کو اونٹوں سے نیچے اتاریں، دوشاخے ان کی گردنوں سے نکال دیئے گئے اور ہاتھ کھول دیئے گئے۔۔۔۔۔ انہیں خالی خیمے میں لے جایا گیا سلطان کے طشت دار اور جاندار ان کے پاس گئے۔ ان کے سروں کو دھویا، عطر لگایا اور شاہی خلعتیں ان کو پہنائیں۔ بادشاہ خود دربار خاص میں آیا اور شراب کی مجلس آراستہ کی گئی۔ اس نے قیدیوں کو شراب نوشی میں شریک کیا۔"

جلال الدین فیروز شاہ کے اس حسن سلوک پر اس کے سب سے معتمد عزیز اور عہدہ دار احمد چپ نے اعتراض کیا کہ باغیوں کی سزا موت ہے جب پر فیروز شاہ نے کہا۔۔۔ "اے احمد جو کچھ تو نے کہا وہ میں بھی جانتا ہوں اور بغاوتوں اور فسادات کے موقعوں پر بادشاہوں کی سزائیں میں نے تجھ سے زیادہ دیکھی ہیں مگر میں اس کو کیا کروں کہ میں اسلامی ماحول میں بوڑھا ہوا ہوں اور مجھے مسلمانوں کا خون بہانے کی عادت نہیں۔ میری عمر ستر سال سے

زیادہ ہے۔ اس مدت میں میں نے کسی موحد کو قتل نہیں کیا۔ اب اس بڑھاپے میں یہ چند روزہ حکومت قائم رکھنے کے لیے جو نہ دوسروں کے بعد رہی ہے اور نہ ہمارے بعد باقی رہے گی۔ اسلامی احکام اور شریعت کے قوانین کو پس پشت ڈال دوں اور حکم دے دوں کہ مسلمانوں کی گردنیں بے دریغ اڑادی جائیں؟ ..... اگر بادشاہی مسلمانوں کے خون بہائے بغیر ممکن نہیں تو مجھ میں ان کا خون بہانے کی طاقت نہیں ہے اور نہ کبھی رہی ہے۔ میں بادشاہی چھوڑے دیتا ہوں کیونکہ خدا کا غضب میں برداشت نہیں ہو سکتا۔

سلطان فیروز شاہ نے خود ہی بیوی کے ذریعے علماء کرام کو یہ تجویز دی کہ جمعہ کے خطبے میں اسے المجاہد فی سبیل اللہ کہا جائے۔ چنانچہ اس عہد کے مقتدر علماء نے یہ محضر نامہ تیار کیا اور اصرار کیا کہ جمعہ کے خطبہ میں اس کے لئے یہ الفاظ استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔ بادشاہ اس عرصے میں اس تجویز پر خود شرمندہ ہو چکا تھا چنانچہ اس نے سر دربار کہا کہ یہ تجویز میری بیوی کے ذریعے آپ کو پہنچی مگر مجھے سخت افسوس اور پشیمانی ہوئی کہ میں نے جو لڑائی بھی مغلوں سے لڑی وہ محض شہرت اور خود نمائی کے لئے لڑی ..... علا کلمتہ الحق کے لئے اور شہادت کی آرزو جو جہاد میں کی جاتی ہے میں نے وہ نہیں کی اس لئے میں اس اعزاز کا ہرگز اہل نہیں؟

ضیاء الدین برنی نے اپنے باپ کے حوالے سے لکھا ہے "جلال الدین کا زمانہ ایک نادر زمانہ ہے۔ یہ ایسا عہد ہے جس میں زبردستی اور جرمانے وصول کرنا، دوسروں کے مال و اسباب کی خاطر جوا کھیلنا، لوگوں کے اوقاف و املاک پر دست درازی کرنا، جو لوگ مر چکے ہیں ان کی میراث اور ان کے ذخیروں اور دفینوں پر نظر رکھنا، قید و بند اور ظلم و تشدد کے ذریعے مسلمانوں کا مال لے لینا، یہ سب کچھ دیکھنے میں نہ آتا تھا۔ بادشاہ اس کے نائبوں اور اس کے مقرر کئے ہوئے افسروں کے ظلم و تعدی سے خواص و عوام کے دل اس عہد میں بے فکر ہیں؟

رنتھنبور کے قلعے پر حملہ کیا، رانا قلعہ بند ہو گیا۔ جلال الدین کئی بار اس قلعے پر حملہ آور ہونے کی سوچتا رہا۔ ویسے بھی اسے مطیع کرنا مقصود تھا، مگر ایک روز اس نے فیصلہ کیا کہ وہ لڑائی

لڑے بغیر واپس چلا جائے گا، یہ پسپائی یا مراجعت شاہی روایت بلکہ غیرت کے خلاف تھی امرا نے واپس جانے کو توہین سمجھا، اصرار کیا کہ بادشاہ حملہ کرے ورنہ مخالف حکمرانوں اور رعایا کے دل سے رُعب اُٹھ جائے گا۔ فیروز شاہ نے کہا "یہ قلعہ اس وقت تک فتح نہیں ہو سکتا جب تک کہ بہت سے مسلمان اپنی جانیں قربان نہ کر دیں گے میں اس جیسے دس قلعوں کے مقابلے میں بھی مسلمانوں کا بال بیکا ہونا پسند نہیں کرتا۔"۔۔۔۔ فیروز شاہ نے یہ کہہ محاصرہ ختم کر دیا اور واپس دہلی چل پڑا۔

۶۹۱ھ میں ہلاکو خان کا نواسہ عبداللہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا، فیروز شاہ فوج لے کر دہلی سے نکلا، فیروز شاہ نہیں چاہتا تھا کہ قتل و غارت ہو، اگرچہ اس کا لشکر بہت بڑا تھا، دونوں لشکر آمنے سامنے تیاری کرتے رہے، درمیان میں دریا پڑتا تھا، دونوں فریقوں کی ٹکڑیوں میں جھڑپیں ہوتی تھیں، پھر دونوں کے مقدمتہ الجیش میں ٹکر ہوئی مغل ہار گئے۔ فیروز شاہ نے بڑی جنگ سے پہلے پھر صلح کی کوشش کی اور عبداللہ اپنی کمزوری کے باعث مان گیا۔ اس نے سلطان کو باپ کہا، سلطان نے اسے بیٹا کہا، تحفے تحائف کا تبادلہ ہوا۔ دور سے ملاقات بھی ہوئی اور یوں فیروز شاہ نے قتل و غارتگری کو طرح دے دی۔ عبداللہ کے بہت سے ساتھی امرا جن میں چنگیز خان کا نواسہ الغ خان شامل تھا مسلمان ہو گئے اور دارالسلطنت کے مختلف محلوں میں آباد ہو گئے۔ ان بستیوں کا نام مغل پورہ پڑ گیا۔

جلال الدین خلجی فیروز شاہ نے ہندوؤں کو سرکاری ملازمتیں دینا شروع کیں، اس کے عہد میں نائین نامی ایک ہندو بہت بڑے عہدے پر فائز تھا۔

فیروز شاہ کو ہندوستان کی موسیقی کے ساتھ بھی بڑی رغبت تھی اور وہ اکثر ہندوستانی راگ سُنا کرتا تھا۔

مختصراً یہ کہ اس زمانے میں بابا فرید گنج شکر کے دم قدم سے غیر مسلموں کا وسیع پیمانے پر اسلام لانا، ہندوؤں کو سرکاری ملازمت دینا، امن و انصاف کی فضا قائم کرنا اور ذاتی طور

پر عاجزی و انکساری کا رویہ اختیار کرنا۔ ۔ ۔ یہ وہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ غالباً اسی عہد میں شاہ حسین کے آباو اجداد نے اسلام قبول کیا اور پڑھے لکھے ہونے کی بنا پر انہیں شیخ کا خطاب دیا گیا۔

فیروز شاہ نام کا تیسرا بادشاہ تغلق خاندان سے تھا۔ اس کی ماں مشرقی پنجاب کے شہر ابوہر کے راجہ رانا مل بھٹی کی بیٹی تھی۔ اس نے اڑتیس برس تک حکومت کی۔ پنجاب میں ایک بار کلانور تک آیا۔ تاہم پنجاب اور دوسرے علاقوں کو مغلوں کے حملے سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی، صرف ایک بار مغل دیپالپور تک آ گئے تھے انہیں پسپا کیا۔ ایک بار سندھ سے واپسی پر دیپالپور سے ہو کر گیا اور تیسری بار اس وقت دیپالپور آیا جب اس نے دریائے ستلج اور دریائے گھاگھرا کے درمیان اڑتالیس کوس لمبی نہر کا افتتاح کیا۔ اس نہر کے باعث بہت سے علاقے سیراب ہوئے اور ان میں خوشحالی آئی۔ دوسری نہر ۱۳۵۶ء میں جمنا سے نکالی جس سے ہانسی اور حصار کے وسیع علاقے سیراب ہوئے، اسی زمانے میں اس نے ایک مضبوط قلعہ بنایا جس کا نام حصار فیروزہ رکھا۔ ۱۳۵۴ء میں دہلی سے ملحق ایک نیا شہر فیروز آباد کے نام سے بسایا۔ مجرموں کے چہروں کو مسخ کرنے کا طریقہ ترک کر دیا۔ سزائے موت ختم کر دی۔ کسانوں پر لگان کا طریقہ ترک کر دیا۔ اصل پیداوار پر مالیہ وصول کیا جانے لگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فیروز شاہ تغلق نے اپنے عہد میں آبپاشی کی خاطر نہروں کے علاوہ پچاس بند بنوائے۔ چالیس مسجدیں مسجدوں سے ملحق تیس کالج یا جامعہ، بیس محل، سو کارواں سرائے، تیس جھیلیں، راستوں میں دو سو برج، سو ہسپتال، پانچ مقبرے، سو عوامی غسل خانے، دس یادگار مینار، دس کنوئیں اور ڈیڑھ سو پل بنائے۔ ان کے علاوہ متعدد باغ اور تفریح گاہیں بنائیں۔ فیروز شاہ تغلق نے ۱۴ ستمبر ۱۳۵۱ء سے ۲۳ اکتوبر ۱۳۸۸ء تک حکومت کی۔

فیروز شاہ تغلق کی والدہ کا بھٹی راجپوت ہونا، فیروز شاہ کے عہد میں سنہری کاموں، اور خوشحالی کے باعث اور تعلیم و تدریس پر زور دینے کے سبب عین ممکن ہے کہ شاہ حسین

کے بزرگوں نے اسی عہد میں اسلام قبول کیا ہو، اس عہد میں زیادہ ترمنگولوں نے حملے کئے اور یہ حملے سندھ، بلوچستان اور ملتان کے راستوں سے براستہ دیپالپور ہوتے چنانچہ ایک طویل عرصہ تک دہلی کے حکمرانوں نے توجہ انہی علاقوں پر رکھی اور لاہور نظرانداز ہو گیا مگر نسبتاً پرسکون گوشہ ہو جانے کے باعث متاثرہ علاقوں کے عالم، فاضل وہاں سے اُٹھ کر لاہور آ جاتے تھے۔ پروفیسر محمد شجاع الدین لکھتے ہیں۔ "ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی حیثیت ختم ہو جانے کے باوجود شہر لاہور علماء و فضلاء کا مسکن رہا۔ چونکہ یہ شہر منگولوں کے راستہ میں نہ پڑتا تھا اور دارالحکومت ملتان اور دیپالپور منتقل ہو جانے کے سبب اس شہر پر منگولوں کی تاخت کے امکانات بھی کم ہو گئے تھے اس لئے اہلِ علم اس گوشۂ تنہائی کو غنیمت سمجھتے ہوئے یہاں پناہ گزین ہوتے رہے۔ اس دور کے ان بزرگوں میں جن کے مزار لاہور میں اب بھی موجود ہیں، سید مٹھا المتوفی ۶۶۱ھ، پیر بلخی (مدفون بازار کشمیری)، سید اسحاق گازرونی (مدفون مسجد وزیر خان المتوفی ۷۸۶ھ اور شیخ سراج الدین عرف پیر سراجی قابلِ ذکر ہیں"۔۔۔۔

حقیقت الفقراء میں شاہ حسین کے والدین کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ جب وہ فیروز شاہ کے عہد میں مسلمان ہوئے تو انہیں شیخ کا خطاب دیا گیا اور انہیں بنی اسرائیل کہا جانے لگا۔

شاہ فیروز ختم پادشہاں — شیخ دادش خطاب در اقراں
شیخ چوں آمدش لقب بے قیل — در نسب شد بنی اسرائیل

پروفیسر علم الدین سالک 'نقوش' کے لاہور نمبر میں شیخ سعد اللہ بنی اسرائیل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ (خیال ہے کہ) بنی اسرائیل ہندوستان کے نومسلموں کی ایک غیر معروف جماعت ہے۔ یہ جماعت عام طور پر کول (علی گڑھ) میرٹھ اور سنبھل وغیرہ شہروں میں آباد ہے بعض کا خیال ہے کہ یہ تغلق کے دورِ حکومت میں یہاں آباد ہوئے۔ سالک صاحب اس رائے کو نہیں مانتے تاہم ان کا کہنا ہے کہ ان کے بزرگوں میں سے کوئی اسرائیل نام کے بزرگ ہوئے ہوں گے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ تاریخ کی مستند کتابوں میں ان (بنی اسرائیلیوں) کا تذکرہ

اکبر کے زمانے میں ملتا ہے۔ بنی اسرائیل تعلیم و تعلّم، علوم و فنون، تصوف و سلوک کے علاوہ خطاطی و نساخی میں بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے نامور عالم پیدا ہوئے۔

متذکرہ بالا مختلف ادوار کے حقائق کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ شاہ حسین کے آباو اجداد عالم فاضل لوگ تھے، انہوں نے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اسلام بھی قبول کیا اور بنی اسرائیل میں بھی شمار ہوئے۔ شیخ کا خطاب بھی انہیں عنایت کیا گیا۔

لاہور ۔۔ یہ نگر سو بار لوٹا گیا

اس بات پر سب لکھنے والوں کا اتفاق ہے کہ شاہ حسین نے خود ساری زندگی لاہور میں گزار دی، ان کے والدین لاہور میں ہی رہے اور ان کے آبا و اجداد بھی لاہوری ہی تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ یوں اس لاہوری خانوادہ کی رگوں میں لاہور زمانۂ قدیم سے لہو بن کر دوڑتا رہا۔ شاہ حسین نے اپنی شاعری میں لاہور کا ذکر اس طرح نہیں کیا جس طرح بلھے شاہ نے کیا تھا۔ ؎

عرش منور بانگاں ملیاں
سُنیاں تخت لہور

(اذان عرش منور پر دی گئی مگر وہ تخت لاہور میں سُنی گئیں۔)

مگر حسین کے اندر بسنے والا لاہور عجب عجب ڈھنگ سے ان کی شاعری میں اپنا روپ دکھاتا ہے۔

میر، ملک، بادشاہ، شہزادے، جلدے نیزے، وجدے واجے
اک گھڑی فنا کریندا ای
کوٹھے، ممٹ تے چوبارے، وس وس گئے کئی لوک وچارے
اک پل رہن نہ دیندا ای

اُچی ماڑی، سوُنے دی سیجا، سب بن جان مسان

(میر، ملک، بادشاہ اور شہزادے ان کے جلو میں چمکتے نیزے اور خوشی کے شادیانے ایک ہی پل میں فنا ہو جاتے ہیں۔

ان ایوانوں، حویلیوں اور شہ نشینوں پر ہزاروں نے قیام کیا مگر سبھی کو کوچ کا حکم ملا۔

اونچی حویلی اس کے اندر سونے جیسی سیج یہ سب تباہ ہو کر شمشان بن جاتے ہیں۔)

انفرادی زندگی کا فانی ہونا حسین کا خاص موضوع رہا ہے اور اس موضوع کے پس منظر میں ان کے شہر پر صدیوں سے بیتنے والی وارداتیں گہرا اثر ڈالتی نظر آتی ہیں۔ خود حسین کے بچپن میں لاہور شہر مغلوں اور پٹھانوں کی چپقلش کی وجہ سے ایک اُجڑا ہوا شہر تھا۔ اسے بہت بعد میں آ کر اکبر نے ایک طرح سے دوبارہ آباد کیا اور بلاشبہ اکبر کے عہد میں پہلی بار اس شہر کو اتنی اہمیت حاصل ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

زمانۂ قدیم سے شہر کے باسی تو یہی دُعا دیتے رہے ہوں گے کہ شہر لاہور تیری رونقیں دائم آباد مگر ان رونقوں کو ایک بار نہیں بیسیوں مرتبہ اجاڑا گیا۔ اس علاقے میں مسلمانوں کے غلبے کے بعد ۴۱۳ھ میں یوں ہوا کہ محمود غزنوی کے حملوں کے باعث قنوج کے راجہ نے محمود کی اطاعت قبول کر لی اس سے راجستھان کے دوسرے راجے خصوصاً کالنجر کا راجہ بہت ناراض ہوا اور دوسرے راجوں کے ساتھ مل کر قنوج پر دھاوا بول دیا۔ محمود کو پیغام ملنے تک راجہ قنوج مارا گیا۔ محمود نے حملہ کیا۔ راجہ کالنجر کے علاقے میں داخل ہوا مگر غزنی میں سیاسی ہلچل کے باعث اسے لوٹنا پڑا۔ اب کے اس نے لاہور کا راستہ اختیار کیا تو لاہور میں اسے پتہ چلا کہ راجہ جے پال نے بھی اپنی فوج کالنجر کے راجہ کی مدد کے لئے بھیجی تھی۔ راجہ جے پال کو خدشہ تھا کہ کالنجر کا غصہ اس پر نکلے گا وہ خود ہی تھوڑی سی فوج لے کر مقابلے پر آ گیا۔ شکست کھائی اور بھاگ گیا۔ محمود نے چاہا کہ شہر میں داخل ہو مگر شہریوں کو خوف تھا کہ فوج انہیں لوٹ لے گی اس لئے محمود کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا۔ محمود نے فوج کو حملے کا حکم دیا۔ شہریوں نے چند روز لڑائی کی مگر ہار گئے۔ فوج شہر

میں داخل ہوئی۔ قتل و غارت گری کا آغاز ہوا، ہزاروں آدمی قتل ہوئے، گھروں کو جلا دیا گیا باقی بھاگ گئے اور دو روز کے اندر شہر کھنڈر بن گیا۔

پھر اسی محمود غزنوی نے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا۔۔۔۔ اس خاندان کے آخری حاکم خسرو ملک نے محمد بن شہاب الدین غوری کا کئی بار کامیاب مقابلہ کیا مگر آخری حملے میں غوریوں نے شہر کو محاصرے میں لے لیا۔ خسرو ملک لڑتا رہا مگر ناچار ہو کر اطاعت قبول کر لی۔ اس کے باوجود غوریوں نے شہر کو لوٹ لیا۔ قتل و غارت جاری رہی۔ ہزاروں بندگان خدا قتل ہوئے، کچھ بھاگ گئے اور جب شہر لٹ چکا تب امان کی منادی کی گئی۔

سلطان شہاب الدین غوری کے مرنے (ضلع جہلم میں قتل)، پر دہلی کی سلطنت اس کے ایک غلام قطب الدین ایبک کے حصے میں آئی جبکہ پنجاب کی حکمرانی دوسرے غلام تاج الدین یلدوز کو مل گئی۔ یلدوز دہلی کا حاکم بننا چاہتا تھا، پہلے اس نے غزنی کو فتح کیا پھر پنجاب پر حملہ آور ہوا۔ لاہور کا حاکم شکست کھا کر دہلی کو بھاگا۔ تاج الدین یلدوز نے اہل لاہور کو مزاحمت کرنے کی سزا اسی طرح دی جس طرح اس زمانے میں دستور تھا۔ قطب الدین ایبک کا دہلی اور لاہور کے درمیان یلدوز کے ساتھ معرکہ ہوا۔ یلدوز شکست کھا کر غزنی کو بھاگ گیا۔ قطب الدین ایبک اہل لاہور کے زخموں پر مرہم رکھنے آیا۔۔۔۔۔ اہل لاہور پر اتنے کرم کئے کہ اسے سلطان لکھ لٹ کا عرف عام مل گیا۔ آخر اسی مٹی میں مٹی ہو گیا۔

سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے عہد میں پنجاب میں قحط بھی پڑا تھا اور مغلوں نے حملہ کر کے اسے تاخت و تاراج کر دیا۔ لاہور کو ایسا لوٹا گیا کہ شہر بے چراغ ہو گیا پھر جلال الدین اور علاؤ الدین نے پنجاب اور لاہور کو بسایا۔ مغلوں کے حملوں کو روکا۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق کے عہد میں تاتاریوں نے دیپالپور اور لاہور کو غارت کیا۔ دہلی کے نائب بھاگ کر دلی چلے گئے اور مغلوں نے اہل لاہور اور اہل پنجاب کے پاس کچھ نہیں چھوڑا۔۔۔۔۔

فیروز شاہ تغلق کے عہد میں بادشاہ کانگڑہ کے محاصرے میں مصروف تھا۔ تاتاریوں نے پھر پنجاب

اور لاہور کو جی بھر کر لوٹا۔ جب فیروز شاہ نے تاتاریوں کا تعاقب کیا تو اس میں لاہور والوں کا اور بھی نقصان ہوا۔

فیروز شاہ کے جانشین محمد شاہ کے عہد میں شیخا گکھڑ نے لاہور تک تباہی پھیلائی۔ دوسری طرف امیر تیمور ملتان تک پہنچ گیا۔ پھر دہلی پہنچا۔ واپسی پر شیخا گکھڑ سے ساتھ نمٹنا پڑا۔ شیخا گکھڑ لاہور میں لڑائی میں مارا گیا۔

کنہیا لال تاریخ لاہور میں لکھتا ہے "لاہور شہر پر آٹھواں صدمہ سید خضر خان کے بیٹے سلطان مبارک شاہ کے عہد میں گزرا جو ہر ایک صدمے سے بڑا شمار کیا جاتا ہے۔۔۔۔ جب ۸۲۸ھ میں خضر خان مر گیا اور مبارک شاہ دہلی کے تخت پر بیٹھا اور ملک میں پھر تازہ تازہ فساد ہوئے تو مسمی جسرت، سیکھا (شیخا) گکھڑ کے بھائی نے پھر پنجاب میں غدر برپا کیا۔ اور بہت سی فوج لے کر لاہور پر حملہ آور ہوا اس دشمنی سے کہ شہر والوں نے اس کے بھائی سیکھا کو امیر تیمور کی فوج کے ہاتھ سے قتل کرا دیا تھا۔ بہ کمال غضب و غصہ شہر کا محاصرہ نہایت سختی کے ساتھ کیا۔ بادشاہی ناظم نے لڑائی میں شکست کھائی اور بھاگ گیا۔ مگر شہر والے لڑتے رہے۔ دو ماہ کے بعد شہر فتح ہوا اور قتل و غارت شروع ہوئی ہزاروں لوگ مارے گئے۔ محلے محلے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ بڑی عمارتیں گرائی اور جلائی گئیں، شہر ویران ہو گیا۔۔۔۔ لاہور آکر بادشاہ نے دیکھا کہ شہر بالکل ویران ہے، ہر محلے میں ہزاروں لاشیں گلی سڑی پڑی ہیں حکم دیا کہ ان نعشوں کو جا بجا گھاتے کھدوا کر دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ سب نعشیں دفنائی گئیں اور گنج شہیداں محلے محلے بنا دیا گیا اور اشتہار دیا گیا کہ جو شخص اس شہر میں آکر آباد ہوگا چھ مہینے کا خرچ بادشاہ سے پائے چنانچہ تین ماہ کے عرصے میں پھر شہر کی آبادی کی صورت قائم ہو گئی۔۔۔۔

"کچھ عرصے بعد جسرت نے کابل کے بادشاہ شیخ علی سے مل کر پھر حملہ کیا۔ پنجاب کا کوئی شہر و بستی و قصبہ و گاؤں ان کے قتل و غارت سے نہ بچا۔ لاہور کی رعایا پھر گھر بار چھوڑ کر بھاگ

گئی۔ یہ خبر سن کر بادشاہ بہ رجعت قہقہری پھر پنجاب میں آیا۔ شیخ علی اور جبرت دونوں کو الگ الگ شکست دی۔

اور آخری تاراجیٔ لاہور شاہ حسین کی پیدائش سے چودہ پندرہ سال قبل ۹۲۹ھ میں لاہور سے چند میل کے فاصلے پر ابراہیم لودھی کے نامزد لشکر کا مقابلہ بابر سے ہوا۔

اقبال صلاح الدین نے تاریخ پنجاب میں لکھا "بابر فاتحانہ انداز سے شہر لاہور میں داخل ہوا یہاں اس کی فوج نے قتلِ عام کے علاوہ خوب لوٹ مار بھی کی۔۔۔۔۔اور کنہیا لال لکھتا ہے؛

"فتح کے شگون کے طور پر لاہور میں داخل ہو کر چند محلے غارت کیے اور چند مکانات جلائے۔ رعایا غارت کے خوف سے بھاگ گئی"۔

حسین کا شہر

نور احمد چشتی شاہ حسین کے آبائی مکان اور محلے کے بارے میں "تحقیقاتِ چشتی" میں لکھتے ہیں:

"بوقت آبادی شہرِ بیرون اس گزر گاہ کا نام محلہ تل بگھ تھا اور خاص اس تکیہ کی سرزمین میں دولت خانہ حضرت حسین (جن کا نام فی زمانہ مادھولال حسین مشہور ہے) تھا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ چالیس برس تک سنِ رواں سے پہلے اس تکیہ کے گوشہ کنگنی میں ایک خُرد مقبرہ تھا اور وہاں کرم علی شاہ مجاور صدر نشین تھا اور اس مقبرہ کو مقام آنول نال حضرت حسین کہتے تھے اور وفورِ زائرین اس قدر تھا کہ مجاور کیلئے خوش گذران رہتا تھا۔ پنجاب کا دستور قدیم ہے کہ جہاں بچہ پیدا ہوتا ہے اس گھر میں اس کا آنول نال گاڑا جاتا ہے۔۔۔۔ جب سکھوں کی چھاؤنی محاذی اس کے زیرِ دیوار فصیل شہر مقرر ہوئی تو انہوں نے اس مقبرہ (یعنی شاہ حسین کے آبائی گھر) کو گرا دیا۔"

گویا شاہ حسین کا آبائی گھر ٹکسالی دروازے کے ساتھ قلعے کی فصیل کے قریب تھا شاہ حسین کی ایک ایسی یادگار بن چکا تھا جہاں زائرین اور معتقدین کافی تعداد میں آیا کرتے تھے اور چشتی کی کتاب سے صرف چالیس برس پہلے یعنی ۱۸۲۴ء میں اسے سکھوں نے اپنی ضرورت کے تحت گرا دیا تھا یا اس پر قبضہ کر کے اسے فوج کے حوالے کر دیا تھا۔

شاہ حسین کے عہد میں لاہور کا نقشہ کیا تھا اور حسین کی تگ و تاز کہاں کہاں تک تھی؟ اس کیلئے

ہم منشی تاج الدین کی کتاب "لاہور قدیم" میں سے لئے گئے کچھ حصے نقوش کے لاہور نمبر سے درج کرتے ہیں۔ اکبر نے اپنے قیام لاہور کے زمانے میں لاہور کو چھتیس حلقوں میں تقسیم کیا۔ ہر حلقے کو گذر کہتے تھے۔ نو گذر شہر کے اندر اور سات گذر شہر کے باہر تھیں۔

اندرون شہر کی تقسیم یوں تھی۔

گذر چھجو دیوانی: موچی دروازے سے شروع ہو کر رنگ محل محلہ سید نظام بخاری اور پیپل ویہڑہ، حویلی میاں خان، محلہ قاضی اسلم، محلہ اخوند محمد فاضل شاہ عالمی سے اکبری دروازہ تک۔

گذر مچھی ہٹہ: شاہ عالمی سے شروع ہو کر رنگ محل تک۔

گذر وچھووالی: یہ گذر اوسط شہر میں ہے۔

گذر مبارز خان: شاہ عالمی کے کوچہ ڈوگراں سے لے کر محلہ جوڑے موری اور لاہوری منڈی تک۔

گذر تلواڑہ: بازار بھاٹی دروازہ کی جانب مغرب تا چورستہ بازار ٹبی۔

گذر رٹہ: اندرون دہلی دروازہ۔ زکی دروازہ سے چورستہ رنگ محل۔

گذر شیخ محمد اسحاق: خضری دروازہ سے چورستہ متصل حویلی جنرل الٰہی بخش۔

گذر شہباز خان: قلعہ کی جنوبی دیوار کے زیر سایہ تا چورستہ حویلی جنرل الٰہی بخش۔

گذر مانک چوک: سید مٹھا سے فصیل دروازہ ٹکسالی و شاہ برج ٹکسالی۔

بیرون شہر کے محلوں کے بارے میں یوں لکھا گیا ہے۔

محلہ حاجی سوائے: بیرون موچی دروازہ۔ قلعہ گوجر سنگھ۔

محلہ طلابخاری: بیرون شاہ عالمی دروازہ... چوبارہ چھجو بھگت۔ (بانسانوالہ بازار، گوالمنڈی اور رتن چند روڈ، میو ہسپتال وغیرہ)

محلہ پیر عزیز جھنگ: پہلے شہر کا حصہ، پھر درمیانی حصہ ویران ہوا۔ اسے موضع بنا دیا گیا۔ اس کے محلے کوٹ عبداللہ شاہ، کوٹ مذاہر، تاج پورہ، قلعہ جہرماوہ،

قلعہ مہر اتر کھان، مبارک پورہ، بستی مہتراں، محلہ نزولی، بھونڈ پورہ۔

محلہ ابو اسحاق : جانب شرق مہز نگ شاہ حسین کے ہم عصر اور معروف استاد ابو اسحاق مہزنگ کے نام پر محلہ

کوٹ کروڑی، محلہ حاجی سرائے سے مشرق کی طرف جہاں شیخ موسیٰ آہنگر کا مقبرہ ہے۔ میکلوڈ روڈ،

محلہ دلاوی، محلہ مہزنگ سے شمال و جنوب جس موقع پر سید چراغ بخاری کا مقبرہ ہے (موجودہ ہائیکورٹ)

قطب غوری : لاہوری دروازہ سے باہر قطب الدین غوری کی قبر کے اردگرد۔

لکھی محلہ : قطب غوری کی مغربی جانب بہت بڑا بازار تھا، لاکھ پتی لوگ رہتے تھے۔

رسول پورہ : مقبرہ شاہ چراغ۔

چوک دارا : شاہ برج موچی دروازہ سے مشرق کی طرف، ایک موریا پل کے سامنے سکھوں کے عہد میں بڑا ویران ہوا۔

محلہ جوہریاں : محلہ حاجی سرائے اور چوک دارا کے درمیان۔

محلہ شاہ کاکو : ریلوے سٹیشن کے ساتھ۔ مسجد شہید گنج۔

نخاس : مسجد وزیر خان کے سامنے لنڈا بازار وغیرہ، یہاں گھوڑوں کی منڈی تھی اس کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسے یا یونیورسٹی۔

محلہ حاجی نالہ : دہلی دروازہ سے نخاس تک نولکھا شاہ برج دروازہ زکی کے مقابل سے موجودہ علاقہ نولکھا تک۔

سید سر : موجودہ ریلوے سٹیشن سے گڑھی شاہو کی طرف۔

کھوہی میراں : یہ اب بھی اسی نام سے ہے۔

منڈی شہزادہ پرویز : میراں دی کھوہی سے مشرق کی جانب تھوڑے فاصلے پر۔

چوہٹہ سوداں : میراں دی کھوہی سے جنوب کی طرف۔

دروازہ مندر : بدھو دا آوہ کے قریب۔ شہر سے فاصلہ دو کوس۔

بیگم پورہ : موضع باغبانپورہ کے قریب۔ سنتاس سے بیگم پورہ تک ایک بازار تھا جس میں کاروباری لکھ پتی تھے۔

محلہ مشکی : بیگم پورہ اور شالامار باغ کے درمیان۔ اکبر کے ایک کارندے نے جس کا نام مشکی تھا حویلی بنوائی جو بھوگیوال کے قریب تھی اس طرح محلے کا نام پڑگیا۔

تیلی ویہڑہ : باغبانپورہ سے مغرب کی طرف۔ قبرستان کے قریب۔

بڑھی بھیلواری : تیلی ویہڑہ سے مغربی جانب (بڑھی، گڑھی، ٹھٹھی، قلعہ کو کہتے ہیں)

محلہ گنج : مقبرہ بہادر خان کے جنوب مغرب میں میاں میر ریلوے سٹیشن کی طرف۔

ٹھٹھی ابوالخیر : گڑھی شاہو۔

بستی میاں میر :

دولت آباد : محلہ ابواسحاق اور محلہ مزنگ کے مشرق میں تھا، قلعے تھے، قلعہ میر محمود، قلعہ میر ارشد خان، قلعہ میر کفایت خان۔

خوجوں کا محلہ : محلہ ابواسحاق کی شمالی جانب۔

باغ نخلی : تھانہ پرانی انار کلی، ٹولنٹن مارکیٹ، عجائب گھر، پنجاب پبلک لائبریری، مغرب میں باغ زیب النساء، شمال میں باغ انار کلی اور انار کلی کے شمال میں محلہ بھارن۔

شیش محل : حضرت داتا صاحب کے دربار کے شمال مغرب میں۔

تل بھوگا / تلہ گھیہ : متذکرہ بالا شیش محل سے بادشاہی قلعہ کی مغربی دیوار میں ٹکسالی دروازہ تک۔ یہیں شاہ جہان نے جنم لیا۔

پنڈ ڈھولاں : محلہ مزنگ کے شمال مشرق میں۔ مکان چلہ شاہ مقیم۔

میانی : اب قبرستان میانی صاحب فرنگ کے جنوب مغرب میں۔

شاہ حسین نے محلہ جھوگا یا ٹلہ بگھ میں جنم لیا، ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی، اپنے محلے کے نواح میں دربار داتا گنج بخش پر کڑی ریاضتیں کیں۔۔۔۔۔ اپنے محلے کے سامنے دریائے راوی سے دوستی رکھی، اس میں رات رات بھر کھڑے ہو کر قرآن پڑھنا۔ یہیں شیخ بہلول نے پانی پینے بھیجا اور خضر سے ملاقات ہو گئی، جس نے دس سال کے شاہ حسین کو سارا قرآن حفظ کرا دیا۔ اسی دریا کے پار عمر کے آخری حصے میں انہیں مادھو لال ایسا دوست مل گیا۔ اسی دریا کے پار انہوں نے اپنی قبر کے لئے جگہ منتخب کی اور کہا کہ تیرہ سال کے بعد یہاں سے اٹھا کر اسے دریا ہی کے کنارے محلہ بابو پورہ میں دفن کیا جائے جو جگہ کہ گورکھ ناتھ کے جوگیوں کا مسکن تھی۔

محلہ نخاس میں شاہ حسین نے شیخ سعد اللہ سے اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کی اور انہی کے مدرسہ سے ناچتا گاتا لال حسین باہر نکلا اور لاہور کو رنگین کر گیا۔

محلہ نخاس میں ہی علی کوتوال نے دُلا بھٹی کو پھانسی چڑھایا مگر سرمست فقیر حسین کے ساتھ زیادتی کرنے کے جرم میں بے وقت اور بے عزتی کی موت مارا گیا۔

شاہی قلعہ سے ہی حکم ہوا تھا کہ حسین کو شرع کی پامالی کے جرم میں سزا ملنی چاہیئے اور اسے اکبر بادشاہ کے حضور پا بجولاں پیش کیا گیا اور حسین نے اپنا مسلک چھوڑا نہ دربار سے رشتہ جوڑا اور اکبر سے یہ وعدہ لے کر واپس شہر میں آ گیا کہ نہ حسین کو دربار میں بلایا جائے گا نہ اکبر کا کوئی امیر کبیر، شیخ الاسلام یا صدر الصدور اس کے تعاقب میں آئے گا۔

اسی شہر کے محلہ بابو پورہ میں جہاں وہ آج دفن ہے مادھو لال کو ایک تنہا مکان میں جانشینی کی سند دی گئی۔

اسی شہر کے چوک جھنڈا میں حتو تیلی اور شاہ حسین کی ملاقات ہوئی تھی جس میں حتو نے کہا تھا کہ

"حتو حسین ہے اور حسین حتو ہے"

اور پھر اسی شہر کے ایک گوشے میں جسے بابو پورہ کہا جاتا ہے جہاں حسین کا دوست اور

مکتب اور استاد

جب شیخ بہلول عرب، ایران اور افغانستان کے سفر سے واپس لوٹے تو کوہ پنج شیر کے "صاحب کہف" کے ارشاد کے مطابق لاہور آئے اور بچے کی تلاش شروع کی جسے کل کو بقول داراشکوہ "ملامتیوں کا سردار ہونا تھا۔ حقیقت الفقراء میں ہے۔

در لہاور رسید شیخ از راہ — در چپ و راست شہر کرد نگاہ
شد بالہام حق بسوئے حسین — زود تر یافت رہ بکوئے حسین
بود کودک حسین آں ہنگام — عمر دہ سال داشت آں ایام
مے بخواندی کلام حق باد ب — داشت قرب و جوار خود مکتب
بود بوبکر حافظ استادش — کز قرآں سبق ہمی دادش

بہلول جب لاہور میں حسین کو تلاش کرتے پہنچے تو وہ اس وقت ایک مسجد میں حافظ ابوبکر کے پاس قرآن حفظ کر رہے تھے۔ عمر اُن کی دس برس کی تھی۔ شیخ بہلول نے حافظ ابوبکر سے حسین کے حالات دریافت کئے اور پھر ان کی تربیت کے لئے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔

"نقوش" کے لاہور نمبر میں لکھا ہے کہ اس وقت ان کے والد تل بگھ نامی ایک محلے میں رہتے تھے جو ٹکسالی دروازے کے باہر دریا کے قریب واقع تھا۔ تل یا تلہ ٹیلے کا بگڑا ہوا نام ہے

تل بگھ کی مسجد میں حافظ ابو بکر ایک بزرگ امامت بھی کراتے تھے اور بچوں کو پڑھایا بھی کرتے تھے وہ بگھ کے مردم خیز قصبہ کے رہنے والے تھے جو تحصیل پنڈ دادنخان ضلع جہلم میں واقع ہے اور جہاں آج بھی عالم فاضل موجود ہیں۔ شاید انہی بزرگوں کے نام پر یہ محلہ تل بگھ کے نام سے مشہور ہو گیا تھا اور حسین کو اسی محلے کی مسجد میں حافظ ابو بکر کے پاس بھٹایا گیا اور انہوں نے چھوٹی سی عمر میں سات پارے حفظ کر لئے۔

بچوں پر اساتذہ کے اثر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اس لئے شاہ حسین کی تعلیم میں اولین حیثیت حافظ ابو بکر بگھوی کو ہی حاصل ہوگی۔ حافظ ابو بکر بگھوی کے بارے میں زیادہ تفصیل میسر نہیں۔ لیکن ان کے مقام کو ان کے خاندان کے بعد کے بزرگوں کے حوالے سے متعین کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس خاندان کو کم از کم نصابی تعلیم دینے میں بہت شہرت حاصل ہوئی اور مولانا علم الدین سالک نے اپنے مضمون "علمائے کرام اور دینی مدرسے" (نقوش لاہور نمبر) میں اس خاندان کے جن نامور استادوں کا ذکر کیا ہے ان سے آشنائی ضروری ہے۔ مولانا سالک لکھتے ہیں "ضلع جہلم میں ایک گاؤں بگھ ہے یہ کسی زمانے میں بہت بڑا علمی مرکز تھا۔ یہاں ایک خاندان آباد تھا جس میں پشت ہا پشت سے حفاظ چلے آتے تھے اور ان میں سے اکثر صاحب تقویٰ وسجادہ ہوتے تھے۔ مولوی غلام محی الدین بگھوی بھی اسی خاندان سے تھے۔ آپ کے والد حافظ نور حیات آپ کے دادا حافظ محمد شفا اور پردادا حافظ نور محمد بگھوی تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی مولوی احمد دین بھی حافظ قرآن تھے۔ مولوی غلام محی الدین ۱۷۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ حافظ حسن سے ناظرہ قرآن کریم پڑھا۔ قرآن حفظ کرنے کا واقعہ بڑا عجیب وغریب ہے۔ صاحب حدائق الحنفیہ لکھتے ہیں۔۔۔۔ "آپ نے تھوڑے عرصے میں قرآن شریف ختم کر لیا تھا مگر حفظ نہیں کیا تھا لیکن چونکہ آپ بڑے خوش آواز تھے اس لئے جب رمضان آیا تو لوگوں نے آپ کے والد ماجد سے درخواست کی کہ اس رمضان میں غلام محی الدین سے قرآن سننا چاہتے ہیں۔ اس پر آپ کے والد نے پوچھا کہ تم قرآن شریف سنا سکو گے۔ آپ نے کہا کہ اگر آپ میرے ساتھ روز ایک پارہ دور کر لیا کریں تو میں سنا دوں گا۔ اس طرح سے آپ

نے اسی رمضان میں قرآن شریف حفظ کر لیا اور سنا دیا۔ آپ سے پوچھا گیا کہ آپ تمام دن میں یاد کیا کرتے تھے۔ فرمایا نہیں صرف چاشت کے وقت تک ایک پارہ حفظ ہو جاتا تھا۔

"آپ نے علماء پنجاب سے پڑھنا شروع کیا یہاں سے فارغ ہو کر آپ اپنے چھوٹے بھائی احمد دین کو ساتھ لے کر دہلی پہنچے اور بارہ برس تک تحصیل علم میں مصروف رہے۔ علم حدیث دونوں بھائیوں نے شاہ عبدالعزیز کے نواسے مولوی محمد اسحاق دہلوی سے پڑھا۔ وہ آپ کی ذہانت سے متاثر ہو کر شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں لے گئے۔ انہوں نے حدیث کے بارے میں بہت سے سوالات کئے جن کا جواب آپ نے تسلی بخش دیا۔ شاہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ آپ کے حق میں دعائے خیر کی اور سندِ حدیث بھی بخشی جب آپ رخصت ہونے لگے تو نصیحت کی کہ "وطن جا کر کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے لوگوں میں تفرقہ پھیلے، جاؤ لوگوں کو آپ سے بڑا فیض حاصل ہوگا۔"

آپ لاہور واپس آ گئے اور برابر تیس برس تک لال مسجد میں درس دیتے رہے۔ آخر میں بیمار ہو کر واپس بگھ چلے گئے۔ چودہ برس تک بیمار رہے۔ اسی حالت میں درس دیا کرتے تھے۔ ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) کو داعئ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کے دو بیٹے تھے دونوں نے علم و فنون کی بڑی خدمت کی۔ ان میں مولوی غلام محمد لاہور کی شاہی مسجد میں امامت کے فرائض ادا کرتے تھے اور مولوی عبدالعزیز بھیرہ کی جامع مسجد میں خطیب تھے، دونوں باپ کے سچے جانشین تھے۔

مولوی غلام محی الدین بگھوی سے تیرہ سال چھوٹے بھائی مولوی احمد دین بگھوی کی زندگی بڑے عجیب و غریب طریقے پر بسر ہوئی۔ یا تو آپ ذکر الٰہی میں مصروف رہتے یا چلتے پھرتے صحت و بیماری میں طالبان علم کو سبق پڑھاتے۔ مروت کا یہ عالم تھا کہ آپ کا کوئی طالب علم بیمار ہوتا تو اُس کے لئے اپنے ہاتھ سے دوا تیار کر کے اسے پلاتے اور جب تک وہ بیمار رہتا اس کی تیمار داری کرتے۔ آپ چھ مہینے بگھ میں درس دیتے اور چھ مہینے لاہور میں۔ ہزارہا عالم ان دونوں بھائیوں سے فیض یاب ہوئے چونکہ آپ ہر وقت درس یا ذکر الٰہی میں مصروف رہتے تھے اس لئے آپ نے بہت کم تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں جو اس وقت موجود ہیں وہ بھی آپ کی نظر ثانی

سے محروم رہیں۔ "حاشیہ خیالی" اور "حاشیہ شرح مُلا" طبقۂ علماء میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں:

مولوی غلام محمد بگھوی لاہور کے سربرآوردہ علماء میں شمار ہوتے تھے کئی سال شاہی مسجد لاہور کے خطیب رہے فتویٰ بھی چلتا تھا۔ آپ کے فتووں کا مجموعہ "فتاویٰ صابریہ" کے نام سے شائع ہوا تھا ۱۹۰۰ء میں فوت ہوئے ان کے انتقال کے بعد سولہ برس تک ان کے صاحبزادے مولوی محمد شفیق شاہی مسجد کے خطیب رہے۔

کنہیا لال نے بھی تاریخ لاہور میں مسلمان علماء و فضلاء کے جن چھ خاندانوں کا ذکر کیا ہے ان میں بگھوی خاندان شامل ہے۔

شاہ حسین کے والدین نے حافظ ابوبکر کا انتخاب بلاوجہ نہیں کیا ہوگا۔ یقیناً ان کے سامنے اس خاندان کی علمیت اور اس مدرسے کی نیک نامی ہوگی۔ پھر شاہ حسین نے جس انداز میں حافظ صاحب کی مسجد میں قرآن حفظ کیا اور سُنایا، یہ روایت خود ان کے خاندان تک پہنچی اور مولوی غلام محی الدین نے وہی عمل دہرایا جو شاہ حسین نے شیخ بہلول کے فیض کے باعث سرانجام دیا تھا۔

تعلیم اور انداز تعلیم

مولانا علم الدین سالک لکھتے ہیں کہ جب ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے لاہور کو اپنے تسلط میں لے لیا اور ان کے حکم سے ۱۸۵۰ء میں لاہور کے تحصیلدار لالہ اجودھیا پرشاد نے سرشماری کی تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے سب چیزوں سے بڑھ کر علم و عرفان کے مرکزوں کو محفوظ رکھا ہے۔ ذیل کے گوشوارے ہمارے اس بیان کی تصدیق کے لیے کافی ہیں۔

شہر کی آبادی	پچاس ہزار تین سو پانچ
دوکانیں اور مکان	اٹھائیس ہزار چھ سو چورانوے
فارسی سکول	ایک سو سولہ
عربی سکول	چھتیس
عربی فارسی مشترکہ سکول	چوالیس
شاستری سکول	اڑتیس
باغات	تیس

کیا پورے پاکستان میں پچاس ہزار کی آبادی کا کوئی ایسا شہر ہے جس میں دو سو چونتیس چھوٹے بڑے سکول موجود ہوں؟ لاہور کا یہ زمانہ تباہی و بربادی کا زمانہ ہے۔ اس سے پہلے

اس شہر پر سکھوں خصوصاً تین سرداروں کے عہد میں بہت تباہی آئی۔ ان سے پہلے احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ نے شہر کو برباد کیا۔ ان سے بھی پہلے شاہ عالم کی جانشینی کی جنگ میں چار میں سے تین شہزادے یہیں لڑتے بھڑتے مارے گئے۔ گویا لاہور کی بربادی کا کیا مذکور ہو کہ یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا۔۔۔۔۔ لٹنے کے باوجود حال یہ تھا کہ اس میں دو سو چونتیس سکول (پرائمری ثانوی اور اعلیٰ) موجود تھے۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ حسین کے عہد میں جب ایک طویل عرصے کی بدنظمی کے بعد اکبر نے اس شہر کو چودہ پندرہ برس تک پورے ہندوستان کا دارالحکومت بنایا۔ دنیا جہان کے عالم فاضل کشاں کشاں لاہور پہنچے۔ سات سمندر پار سے آ کر پرتگیزیوں نے اپنا مشن اور سکول بھی کھول لیا۔ تو اس زمانے میں یہاں تعلیم کا معیار کیا ہو گا۔۔۔۔۔ شاہ حسین نے دس برس کی عمر سے لے کر چھتیس برس کی عمر تک تعلیم کے کیسے کیسے کڑے مرحلے طے نہ کیے ہوں گے۔ کیسے کیسے عالم فاضل لوگوں سے فیض نہیں پایا ہو گا۔ شیخ سعداللہ ابواسحاق قادری، شیخ بہلول اور سید داؤد کرمانی شیر گڑھی ان میں سے چند نام ہیں جب مخدوم الملک شیخ الاسلام، مولانا عبداللہ سلطان پوری سے شاہ حسین کا مکالمہ ہوا ہو گا تو ایک طرف اس عہد کے علم کا پہاڑ مخدوم الملک تھا تو دوسری طرف جو بھی ہو گا وہ علم و فضل کے اعتبار سے کوئی ایسا کم تو نہ ہو گا۔

حسین نے اس زمانے میں چھتیس برس کی عمر تک کیا کچھ پڑھا ہو گا۔ حقیقت الفقراء میں اس کی تفصیل درج نہیں۔ خلیق احمد نظامی "حیات عبدالحق محدث دہلوی" میں لکھتے ہیں۔ "سرزمین ہند کی فضا اس قابل ہو گئی تھی کہ رازی و غزالی کے پایہ کے عالم پیدا کر سکے۔ مولانا سید عبدالحئی مرحوم نے دور اول کا مندرجہ ذیل نصاب بتایا ہے۔

نحو :۔ کافیہ، لب الالباب، مصنفہ قاضی ناصرالدین بیضاوی

فقہ :۔ ہدایہ

اصول فقہ :۔ منار، اصول بزدوی

تفسیر :۔ مدارک، بیضاوی، کشاف

تصوف :۔ عوارف، فصوص

حدیث :۔ مشارق الانوار اور مصابیح السنۃ

ادب :۔ مقالات حریری

منطق :۔ شرح شمسیہ

فن کلام :۔ شرحِ صحائف۔ تمہید ابو شکور سالمی۔

لیکن یہ فہرست مکمل نہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ اور کتابیں بھی اس زمانے میں لوگوں کے مطالعہ میں رہتی تھیں گو باقاعدہ طور پر نصاب میں شامل نہ تھیں۔ معاصر تذکروں، تاریخوں اور ملفوظات کی بنیاد پر ہم مندرجہ ذیل فہرست پیش کرتے ہیں تاکہ اس عہد کے مسلمانوں کے عام دینی اور علمی رجحانات کا اندازہ ہو سکے:

۱۔ قوت القلوب	۲۔ احیاء العلوم	۳۔ رسالہ قشیری
۴۔ مکتوبات عین القضاۃ	۵۔ مرصاد العباد	۶۔ لوائح قاضی حمید الدین ناگوری
۷۔ تفسیر امام ناصری	۸۔ نوادر الاصول مولانا علاؤ الدین ترمذی	
۹۔ روح الارواح	۱۰۔ مقصد الاقصیٰ	۱۱۔ استاد حلیہ شیخ عبداللہ تستری۔
۱۲۔ کیمیائے سعادت	۱۳۔ تحفۃ الشباب	۱۴۔ نہج البلاغۃ ۱۵۔ کنز الادب
۱۶۔ تفسیر حقائق	۱۷۔ فقہ معقول	۱۸۔ اخبار الاثمار۔
۱۹۔ مصباح الدجیٰ	۲۰۔ سیر الملوک	۲۱۔ تعرف۔
۲۲۔ مکتوبات مولانا فخر الدین	۲۳۔ قدوری	۲۴۔ مجمع البحرین
۲۴۔ تذکرۃ الاولیاء	۲۵۔ خمسہ نظامی۔	

یہ نصاب اکبر کے عہد سے بہت پہلے سے چلا آتا تھا مگر پروفیسر سالک کا خیال ہے کہ اکبر کی خوش قسمتی تھی (اور شاہجہاں کی بھی) کہ اس کے زمانے میں بعض یگانہ روزگار ہستیاں اس کے گرد و پیش جمع ہو گئی تھیں۔ سیاسی طور پر اس کا زمانہ کتنا ہی پُرعظمت کیوں نہ ہو مگر

درحقیقت یہ زمانہ علمی اور فنی حیثیت سے اپنی مثال آپ تھا اور اسی بنا پر اکبر کی شہرت دور دور نزدیک پھیل گئی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکبر نے پہلی مرتبہ کوشش کی کہ تعلیم عام ہو اس نے اس سلسلے میں پوری توجہ مرکوز کی۔ یہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جس کے مقابل اس کی ساری فتوحات اور سرگرمیاں ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ علامہ ابوالفضل نے غیر مسلموں کے نصاب تعلیم کے متعلق لکھا ہے۔

" اخلاق، حساب، فلاحت، مساحت، ہندسہ، نجوم، رمل، تدبیر منزل (پلاننگ) سیاست، مدن، طب، منطق، طبیعات، ریاضی، تاریخ اور ہندی علوم میں سے بیاکرن، نیائے، بیدانت، پاتنجلی"

اس عہد کے ایک اور پہلو کی طرف بھی مولانا سالک نے اشارہ کیا ہے "حکمت اور فلسفہ کا ایک طوفان امڈ کر ایران و توران سے بھی ہندوستان میں داخل ہوا کیونکہ وہاں کے حکمرانوں نے فلسفہ (اور منطق) وغیرہ کا پڑھنا، پڑھانا حکماً روک دیا تھا۔ ۔ ۔ مشائخ اور علماء نے توران کے بادشاہ عبداللہ خان ازبک سے استدعا کی کہ وہ منطق کا پڑھنا حرام قرار دے اور اس کے پڑھنے پڑھانے والوں کو ملک سے نکال دے چنانچہ کئی معقول جیسے قاضی ابوالمعالی، مُلّا مرزا جان، مُلّا عصام الدین وغیرہ وہاں سے نکالے گئے اور ان میں سے اکثر ہندوستان چلے آئے۔

شاہ حسین کے عہد میں جو معروف کتابیں لکھی گئیں یا ترجمہ ہوئیں ان کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کیونکہ شاہ حسین اپنی تعلیم کے اعتبار سے اپنے عہد کے علماء اور صوفیاء کے مقابلے میں بہت پڑھے لکھے نظر آتے ہیں۔ خلیق احمد نظامی نے جو تفصیل دی ہے اس کا اجمال یہ ہے۔

۹۸۱ھ سید محمد گیسو دراز کے حالات پر مشتمل خوارقات"۔ شیخ خوب محمد چشتی کی صراط المستقیم۔ ۹۸۷ھ عباس شیروانی کی تحفۂ اکبر شاہی۔ ۹۹۰ھ "مہابھارت" کا فارسی میں ترجمہ مولانا عبدالقادر بدایونی۔ ۹۹۳ھ فیضی کی مرکز ادوار مکمل ہوئی۔ تاریخ الفی شروع ہوئی نور اللہ شستری نے "مجالس المومنین" لکھنی شروع کی۔ ۹۹۴ھ بابر نامہ کا فارسی ترجمہ شروع ہوا۔ ۹۹۵ھ فیضی نے لیلاوتی کا ترجمہ کیا۔ جوہر نے "تذکرۃ الواقعات" کی ابتدا کی۔ ۹۹۶ھ ابوالفضل نے

بحرِ دانش مکمل کی۔ ۹۹۸ھ بابر نامہ کا فارسی ترجمہ مکمل ہوا۔ "جذب القلوب الی دیار المحبوب" شروع کی ۹۹۹ھ عبدالقادر بدایونی نے رامائن کا فارسی ترجمہ مکمل کیا۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے "اخبار الاخیار" مکمل کی۔ ۱۰۰۰ھ بایزید نے تاریخ ہمایوں مکمل کی۔ علی بن عزیز اللہ طباطبائی نے "برہان المآثر" لکھنا شروع کی۔ ۱۰۰۱ھ جذب القلوب مکمل ہوئی۔ ۱۰۰۲ھ فیضی کی سواطع الالہام مکمل ہوئی۔ امین رازی کی ہفت اقلیم مکمل ہوئی۔ نظام الدین ہروی کی طبقات اکبری ختم ہوئی۔ ۱۰۰۳ھ زاد المتقین اور فیضی کی "نل ودمن" (ترجمہ) مکمل ہوئی۔ ۱۰۰۴ھ برہان المآثر مکمل ہوئی۔ غالباً ۱۰۰۴ھ میں ہی مُلّا عبدالقادر بدایونی نے "نجات الرشید" لکھی جس میں حسین فقیر کا ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا کہ یہ باقاعدہ سماع کا شوق رکھتا تھا۔ عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ اور اکبر نامہ مکمل ہوا۔ ۱۰۰۶ھ مُلّا فرید الدین مسعود بن حافظ ابراہیم دہلوی کی "سراج الاستخراج" مکمل ہوئی اور یوگ وشسٹھ کا ترجمہ مکمل ہوا۔ ۔ ۔ ۔ اور ۱۰۰۸ھ میں شاہ حسین انتقال کر گئے۔

پیر و مرشد

بہلول
داتا کا دربار
شیخ سعداللہ

بہلول

دس سال کی عمر سے لے کر اڑتیس برس کی عمر تک شاہ حسین کو جن بزرگ کی تربیت اور راہنمائی حاصل رہی ان کا نام بہلول تھا۔ بہلول ہی پہلے بزرگ تھے جنہوں نے شاہ حسین کی زندگی کے نئے ڈھب یعنی رندی و قلندری کو بھی تحسین کی نظر سے دیکھا، جب شاہ حسین ابھی دس سال کے تھے اور ایک مدرسہ میں قرآن کریم حفظ کر رہے تھے اس وقت بہلول عرب، عراق اور افغانستان کا چکر لگا کر خصوصی طور پر شاہ حسین کے لئے لاہور تشریف لائے۔

بہلول ۹۲۱ھ میں ضلع جھنگ کے قصبہ لالیاں کے قریب دریائے چناب کے کنارے موضع بہلول کے میں پیدا ہوئے، ذات سپراجاٹ تھی، والد کا نام بانی یا تینی تھا۔ خاندان کاشت کار تھا اور کچھ رشتہ دار فوج میں بھی ملازم تھے۔ "تذکرہ اولیائے جھنگ" کے مصنف بلال زبیری مرحوم کے مطابق بچپن سے آپ سے خوارق واقعات ظہور میں آنے لگے۔ لوگوں میں شہرت ہونے لگی پانچ سال کی عمر میں ایک قریبی مدرسہ میں داخل کر دیئے گئے لیکن کیفیت یہ تھی کہ استاد ایک سبق پڑھاتا تو یہ اس سے اگلے والا سبق سنا دیتے، استاد حیرت زدہ رہ جاتا، چنانچہ استاد نے ان کے والد کو مشورہ دیا کہ بہلول کو تعلیم و تربیت کے لئے کسی درویش کے پاس بھجوا دو، گویا استاد نے انہیں پڑھانے

سے معذوری ظاہر کردی، والد کے نہ وسائل ہوں گے نہ انہیں کوئی ایسا درویش ملا جس کے پاس اپنے نونہال کو بھیج دیتے، بہلول نہ مدرسہ میں تھے نہ گھر کے کاموں میں، اسی طرح زندگی گزارتے رہے۔ بیس سال کے ہوئے تو انہوں نے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے بیرونِ ملک جانے کا ارادہ کیا، والدین کی خواہش تھی کہ ان کی شادی ہو جائے، اس لئے مرضی نہ ہونے کے باوجود قبیلے ہی کی ایک لڑکی سے شادی کر لی، اس کے بطن سے دو لڑکے محمد علی اور ولی محمد پیدا ہوئے۔

اٹھائیس تیس برس کی عمر میں پھر دیارِ حبیبؐ دیکھنے کی شدید خواہش ہوئی۔ چنانچہ سیاحت اور زیارت حرمین شریف کی اجازت حاصل کی اور سفر پر چل نکلے۔ سب سے پہلے نجف اشرف میں حضرت علی کے روضے پر گئے دو سال تک یہاں مقیم رہے۔ محمد پیر (حقیقت الفقراء) کے لکھنے کے مطابق دو سال تک روضے پر جھاڑو دیتے اور عبادت کرتے رہے اور جو کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے حاصل ہوا مگر حضرت علی کا حکم ہوا کربلا میں امام حسینؓ کے روضے پر حاضری دی جائے۔

شیخ بہلول نجف اشرف سے کربلا کو گئے، جہاں امام حسین کے روضے کے قریب ہی قیام کیا اور روضے کی دیکھ بھال پر بھی پوری توجہ دی۔ حسب معمول انہوں نے یہاں پر بھی روزانہ جھاڑو دینا شروع کیا۔ بہلول تین ماہ تک اس روضے پر گویا اعتکاف میں رہے۔ یہاں سے انہیں بطحا جانے کا اشارہ ملا۔

امامؑ کی توجہ ہونے کے بعد وہ مکہ کو روانہ ہوئے جہاں ان دنوں حج ہونے والا تھا۔ بہلول نے مکہ پہنچ کر حج کی تمام رسومات میں شرکت کی۔ فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد مدینہ کو روانہ ہوئے۔ جہاں سب سے پہلے بزرگان دین کی قبروں پر حاضری دی، امام حسن کے مزار پر حاضر ہوئے اور ایک دن اور ایک رات وہاں گزاری، پھر حضرت زین العابدین کے مزار کا طواف کیا اور تین دن اور تین راتیں یہاں پر گزاریں، اس کے بعد امام باقر، امام جعفر صادق، حضرت بی بی فاطمہ زہرا، حضرت عثمانؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی قبروں پر حاضری دینے کے بعد وہ روضۂ رسول پر حاضر ہوئے اور چھ ماہ تک یہاں ریاضت کی، رسول اکرمؐ کی طرف سے انہیں بغداد جانے کا حکم ہوا۔

بہلول کو گھر سے نکلے چار پانچ سال ہونے کو آئے تھے، پیغمبر خدا کے فرمان کے مطابق وہ مدینہ سے بغداد پہنچے اور امام اعظم حضرت عبدالقادر جیلانی کے مزار پُر انوار پر عبادت شروع کی، پورا ایک سال حضرت عبدالقادر جیلانی کے مزار پر رہے اور صراط المستقیم دکھانے کی دعا کرتے رہے۔ آخرش اشارہ ہوا کہ مشہد میں امام موسیٰ کاظم کے مزار پر حاضری دی جائے، بہلول بغداد سے مشہد کو روانہ ہوئے، امام کے مزار پر حاضری دی، یہاں پر بھی وہ ایک سال تک عبادت کرتے رہے اور علم کا حصول بھی جاری رہا کہ ان مزاروں پر بہت دور کے ممالک کے علماء اور صوفیاء آیا کرتے تھے۔ امام موسیٰ رضا نے بہلول کو اشارہ کیا کہ افغانستان میں کوہ پنج شیر پر جائیں اس کی چوٹی پر چڑھ کر دیکھیں گے تو ایک ایسا غار نظر آئے گا جیسا اصحاب کہف کا تھا، اس غار میں ایک فقیر صاحب کمال ظاہراً مجذوب اور فی الاصل حیرت افزائے ساکنانِ مسلک بسلسلۂ قادریہ ہے۔ اس بزرگ سے آپ کو مقصد حاصل ہوگا۔

شیخ بہلول نے ایران سے افغانستان کی طرف سفر کا آغاز کیا، کوہ پنج شیر کی مخصوص غار پہ پہنچے۔ اندر دیکھا تو ایک بزرگ فنافی اللہ سر مراقبہ میں ڈالے بیٹھا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو روپ ملے تھے، یہ دونوں اس کی آنکھوں سے عیاں تھے، جب وہ ایک جلالی نگاہ ڈالتے جو کچھ سامنے ہوتا جل کر خاک ہو جاتا اور پھر جب وہ جمالی نگاہ سے دیکھتے تو پھر آبادی اور شادابی لوٹ آتی۔ جو شخص اس وقت ان کے سامنے ہوتا اسے ولایت کا درجہ حاصل ہو جاتا۔

شیخ بہلول جب پنج شیر پہنچے تو ان دنوں اس بزرگ پہ جلالی کیفیت طاری تھی، اتفاق کی بات کہ اس وقت وہ مراقبہ میں تھے اس لئے بہلول لوٹ آئے۔ لوگوں نے انہیں مبارک دی کہ بچ گئے ہو اس لئے اب ان کی دوسری کیفیت جمالی کے واپس آنے تک انتظار کریں۔

مرد مست نہ جانے کب سے مراقبے میں تھا چنانچہ بہلول نے انتظار میں بہت دن گزار دیئے اسی اثنا میں وہ قریبی دیہات سے بال تراشنے کا سامان لے آئے تا کہ جب مردِ قلندر کا مراقبہ ختم ہو تو وہ ان کے بال وغیرہ تراش لیں۔ جب یہ مرد بزرگ مراقبہ کی حالت سے معمول کی حالت پر آئے تو

ان کی کیفیت جمالی تھی، بہلول نے آگے بڑھ کر سلام کیا، سفر کا سبب بیان کیا، اور اس سے پہلے یہ عرض کی کہ اگر اجازت ہو تو بال تراش دوں، مجذوب نے اجازت دی، بہلول نے روضوں پر حاضری اور آخری حکم امام موسیٰ کاظم کا سنایا، مجذوب نے سب کچھ سکون سے سُنا۔۔۔۔ شیخ بہلول نے اجازت چاہی تو مردِ قلندر نے ان کے سر اور چہرے کو بوسہ دیا اور کہا کہ انہی پاؤں لاہور چلے جاؤ اور حسین کی تربیت کرو۔

شیخ بہلول یہ سُنتے ہی کوہ پنج شیر سے لاہور کو روانہ ہوئے اور تلہ بگا کی مسجد میں ابوبکر کے مدرسہ میں پہنچ کر دس سالہ حسین سے ملے۔ اس وقت حسین کی عمر اگر دس کی تھی (۹۵۵ھ) تو شاہ بہلول کی عمر پینتیس سال کے قریب تھی۔

محمد پیر نے شاہ حسین کی تعلیم و تربیت کے بارے میں جتنی تفصیل درج کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کئی سال لاہور میں مقیم رہے۔

پروفیسر علم الدین سالک نے نقوش کے لاہور نمبر میں لاہور کے تعلیمی اداروں اور اساتذہ کے بارے میں جو باب تحریر کیا ہے اس میں ایک معروف مدرسہ بہلول کا ذکر ملتا ہے۔ پروفیسر سالک لکھتے ہیں۔ "یہ مدرسہ بھی شاہجہان کے عہد میں لاہور کی مشہور درسگاہوں میں شمار ہوتا تھا۔ مآثر الامراء کا مصنف کہتا ہے کہ شیخ بہلول ایک جید عالم اور زبردست فاضل تھے۔ ان کی شہرت کا آفتاب جہانگیر کے آخری ایام حکومت میں نصف النہار پر تھا۔ اس مدرسے میں قاضی اسلم نے تعلیم پائی جو خواجہ کوہی کی اولاد سے تھے اور مشہور صاحبِ دل بزرگ ہوئے ہیں جب وہ ہرات سے لاہور پہنچے تو تکمیل تعلیم کے لئے اسی مدرسے میں داخل ہوئے۔ تکمیل تعلیم کے بعد آپ کا شمار ہندوستان کے مشاہیر علماء میں ہوا۔"

پروفیسر سالک نے مدرسہ شیخ بہلول کو شاہجہان کے عہد کی معروف درس گاہ قرار دیا ہے اور قاضی اسلم کو اس سکول میں اس وقت دکھایا ہے جب وہ ہرات سے آئے۔ مگر اس کے چھوٹے بھائی میرک شیخ ہروی کو جہانگیر کے زمانے میں ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔ میرک شیخ ہروی ایران سے لاہور آیا۔

وہ عہد جہانگیری کے مشہور فاضل اور قاضی محمد اسلم کا بھتیجا تھا۔ ۔ ۔ ۔ وہ مُلا عبد السلام لاہوری کا شاگرد ہوا۔ جب یہاں سے فارغ ہوا تو جہانگیر نے اسے پہلے دارا شکوہ اور بعد میں دوسرے شہزادوں کی تعلیم پہ مامور کیا۔ شاہجہان کے زمانے میں وہ دو ہزاری منصب دار تھا۔ عالمگیر نے اسے تمام مملکت کا صدر الصدور بنایا۔ میرک شیخ ۱۰۷۱ھ (۱۶۶۰ء) میں فوت ہوا۔

مقالات مولوی محمد شفیع جلد چہارم (مرتب احمد ربانی) میں بختاور خان کی کتاب "مراۃ العالم" کے اقتباسات میں درج ہے۔

" در ابتدائے سلطنت جنت مکانی بلاہور آمدو در خدمتِ شیخ بہلول تلمذ نمودہ باکبر آباد رفتہ ملازمت جنت مکانی کرد" ۔ ۔ ۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ شیخ بہلول بہت دیر تک لاہور میں درس و تدریس میں مصروف رہے اور آخری عمر میں واپس اپنے علاقے میں چلے گئے۔ جہاں ان کا انتقال بقول بلال زبیری ۱۰۳۹ھ میں ہوا۔

شاہ حسین کے قرآن حفظ کرنے کے بعد بہلول ان کی تعلیم و تربیت کرتے رہے اور زیادہ تر یہ کام حضرت علی ہجویری کے مزار پر کیا کرتے تھے۔ حسین کو مزید عبادات وغیرہ کی تلقین کرنے کے بعد کہا کہ وہ علی ہجویری کے مزار پر بھی حاضر رہے، ایک روز خود علی ہجویری تمہیں ہدایت دیں گے۔

بہلول حسین کی تربیت سے فراغت پانے کے بعد اپنے وطن لوٹے مگر بہلول کے جانے کی بجائے اکبر سے باغی دُلا بھٹی کے قصبہ پنڈی بھٹیاں کے قریب موضع قلعہ کنگراں (کھنگراں) میں زمیندار ابدال احمد کی مزروعہ زمین پہ جھونپڑی ڈال لی اور ریاضت کی منزلیں طے کرنے لگے۔ شاہ بہلول کے پاس بڑے سے بڑا آدمی بھی جب آتا تھا تو وہ کسی کے احترام میں کھڑے نہیں ہوتے تھے مگر جب معمولی زمیندار ابدال احمد آجاتا تو وہ احتراماً کھڑے ہو جاتے اس پر لوگ چہ میگوئیاں کرتے کہ فقیر یوں نہیں کیا کرتے۔ بہلول ابدال احمد کا اس خوف سے احترام کرتے ہیں کہ کہیں وہ انہیں اپنی اراضی سے بے دخل نہ کر دے۔ یہ بات مشہور ہوئی تو آپ نے اولاً اس کا کوئی نوٹس نہ لیا لیکن جب عقیدتمندوں نے بار بار اصرار کیا کہ یہ راز سمجھایا جائے تو انہوں نے بتایا کہ میں ابدال احمد کا احترام اراضی سے بیدخل

کیئے جانے کے خوف سے نہیں کرتا بلکہ اس لئے کرتا ہوں کہ ابدال احمد کی پشت میں سے ایک لڑکا ہو گا جو اپنے عہد کا کامل ولی ہو گا اس کا نام برخوردار ہو گا اور میرے ہونے والے پوتے برخوردار کا ہم عصر ہو گا...... بلال زبیری کے مطابق ابدال احمد کا بیٹا حافظ برخوردار ہوا جو واقعی خدا رسیدہ تھا اس کا مزار میاں بکھا کے نام سے موضع برخوردار علاقہ تھانہ بھوانہ ضلع جھنگ میں موجود ہے۔

شاہ بہلول کو حسین کے بارے میں پوری خبر ملتی رہتی تھی، حسین لاہور شہر میں علم کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہے تھے مرشد کے حکم کے مطابق حضرت علی ہجویری داتا گنج بخش کے مزار پر عبادت اور ریاضت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ غالباً خود بھی کچھ پڑھانے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ مگر آپ اس عہد کے عظیم استاد شیخ سعد اللہ کے پاس علاقہ نخاس کی جامعہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہیں اُن پر ایک دوسری کیفیت طاری ہوئی، انہوں نے داڑھی مُنڈا دی، پاؤں میں گھونگھرو باندھ لئے، ہاتھ میں صراحی لے لی اور رقص وسماع کی محفلیں برپا کرنے لگے۔ انہیں دنوں ان سے مزید خارق عادت واقعات بھی صورت پذیر ہونے لگے۔ شہر میں بہت شور ہوا۔ خبر شیخ بہلول تک بھی پہنچی۔ وہ علاقہ جھنگ سے لاہور آئے، شاہ حسین سے سربازار ملاقات ہوگئی۔ شاہ حسین اسی رندی اور مستی کی کیفیت میں تھے۔ مگر مرشد کو پہچان لیا، مرشد نے آگے بڑھ کر پکڑ لیا۔ شاہ حسین نے خود کو ان کے سپرد کر دیا۔ بہلول نے شاہ حسین کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ پھر حسین کو دعا دی اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر واپس اپنے علاقے میں چلے گئے۔ یہ واقعہ ۹۸۱ھ کا بتایا جاتا ہے۔ محمد پیر کے کہنے کے مطابق دو برس بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

داراشکوہ کی حسنات العارفین (اردو ترجمہ) میں بالواسطہ طور پر شیخ بہلول کا ذکر ہے کہ ایک روز اس (شاہ حسین) کے پیر نے کہا کہ تمام قرآن نماز میں پڑھ اور اس نے پڑھنا شروع کر دیا جب سورہ الم نشرح لک صدرک پر پہنچا زور سے ہنس پڑا اور نماز ادا کی اور باہر چلا گیا اور پھر اپنے شیخ کی خدمت میں نہ آیا۔ شاید خندہ شاہ حسین کا اس بنا پر تھا کہ تفسیر اس سورت کی اس کے دل پر ایسی گزری ہو۔ الم نشرح لک صدرک (آیا ہم نے تیرے سینے کو توحید اور معرفت سے نہیں

کھولا) اور تجھ پر بارِ وہم اور انانیت نہیں ڈالا جو تیری پشت کو پست رکھتا تھا۔ اور کیا ہم نے تجھ کو ذکر سے مذکور تک نہیں پہنچا دیا۔ سو اس لئے کہ ہر فنا کے ساتھ بقا ہے اور بے شک جس کو ہم نے فنا بخشی اسے بقا سے باقی کر دیا۔ سو جس وقت تو نے انانیت اور ہستیٔ موہوم سے فراغت حاصل کی سو ہماری ہستی پر مقیم رہ اور اپنے پروردگار کی ہستی کی طرف متوجہ ہو جو ظاہر اور باطن کا رب ہے۔"

آخری عمر میں ان پر بھی جذب و مستی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی، اسی عالم میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کا مزار پنڈی بھٹیاں کے قریب جھنگڑ شاہ بہلول میں ہے۔ جہاں جون کے مہینے میں میلہ لگتا ہے۔

بلال زبیری "تذکرہ اولیائے جھنگ" میں لکھتے ہیں "آپ کے دو لڑکے ہوئے۔ بڑے کا نام محمد علی رکھا اور چھوٹے کا ولی محمد۔ محمد علی کی شادی حضرت شیخ محمد حسین گیسو دراز کے خلیفۂ مجاز حضرت حسن بخت کی صاحبزادی زینت بیگم سے ہوئی جن سے چار لڑکے ہوئے ان میں سے بڑے لڑکے کا نام فتح محمد اور چھوٹے کا محمد الیاس ......

محمد علی گلبرگہ تشریف لے گئے اور حیدر آباد میں ملازمت اختیار کر لی۔ فتح محمد اور الیاس حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور اپنی والدہ کے ہمراہ اراکاٹ چلے گئے۔ فتح محمد نواب اراکاٹ کے ہاں ملازم ہو گئے۔ فتح محمد کے دو لڑکے شہباز خان اور حیدر علی پیدا ہوئے۔ شہباز خان بڑے تھے۔ نواب برار کے ہاں ملازم ہو گئے۔ حیدر علی چھوٹے تھے وہ میسور کی فوج میں شامل ہو گئے۔ بعد میں یہی حیدر علی فاتح میسور کے نام سے تاریخ ہندوستان میں متعارف ہوئے۔ سلطان حیدر علی نے دوسری شادی والیٔ اراکاٹ نواب سعادت علی خان کی لڑکی فاطمہ عرف فخر النساء سے کی جس سے مجاہد اعظم حضرت سلطان فتح علی ٹیپو پیدا ہوئے۔ کرنل وِلکس نے ہسٹری آف میسور میں صفحہ ۱۴۹ پر لکھا ہے۔

عبداللہ بٹ مرحوم کی مرتب کردہ کتاب ٹیپو سلطان میں شجرہ یوں بنایا گیا ہے:۔

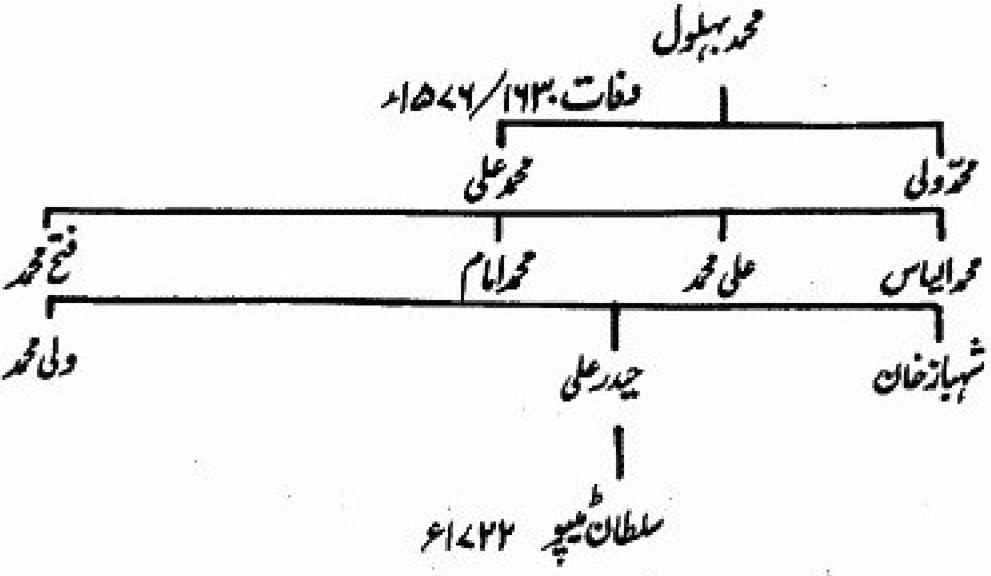
محمد بہلول
وفات ۱۶۳۰/۱۵۷۶ء
محمد ولی
محمد علی
محمد الیاس
علی محمد
محمد امام
فتح محمد
شہباز خان
حیدر علی
ولی محمد
سلطان ٹیپو
۱۷۲۲ء

داتا کا دربار

جب شیخ بہلول شاہ حسین کو تعلیم و تربیت سے آراستہ کر چکے اس وقت حسین کی عمر اندازاً بیس بائیس برس تھی۔ بہلول جو فریضہ اپنے سر پہ اٹھائے مکہ، مدینہ، ایران اور افغانستان سے لائے تھے وہ انہوں نے بخوبی ادا کیا تو واپس اپنے وطن چندیوٹ (چنیوٹ) جانے کا عزم کیا لیکن اس وقت بھی حسین کا زہد و ریاضت میں بہت سے مراحل سے گزرنا باقی تھا۔ ان کا تعین شیخ بہلول نے غالباً خود ہی کر رکھا تھا۔ شیخ بہلول نے لاہور میں قیام کے دوران صرف حسین کی ہی تربیت نہ کی تھی بلکہ باقاعدہ ایک مدرسہ جاری کیا تھا جس کو بعد میں خصوصاً شاہجہان کے عہد میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ تاہم کہا جا سکتا ہے کہ شیخ بہلول نے یہ مدرسہ بھی صرف حسین کی تربیت کے لئے قائم کیا تھا اب اس سے اگلا مرحلہ یہ تھا کہ حسین حضرت علی ہجویری کے مزار پر مسلسل عبادت کریں۔۔۔۔ چنانچہ شیخ بہلول نے رخصت ہوتے وقت حسین سے کہا کہ مجھے پیران پیر شیخ محی الدین عبدالقادر گیلانی سے ارشاد ہوا تھا کہ تمہاری تعلیم کروں اور اس کے بعد اپنے وطن لوٹ جاؤں۔

من چوں چاہے نہم زشہر برون — مشو از ہجر صوریم محزون
کز رہِ احتیاط در ایں جا — از پئے تربیت براہِ خدا
بسپردم ترا بہ پیر علی — کز درِ فیض اوست لم یزلی

ہست آں پیرِ کامل از ہجویر — کہ ندیداست جز خدا او غیر
ہر مرادے کہ داری اندر دل — آں مراد از درش کند حاصل
اوست حاجت روائے محتاجاں — اوست مشکل کشائے محتاجاں
اوست الحق مراد بخش جہاں — اوست چابک سوار رخش جہاں
اوست پیرِ ولایتِ لاہور — روضۂ پاک اوست مظہرِ نور
او مربی تست در رہِ حق — او رساند ترا بدرگہِ حق
بایدت کرد خدمتِ آں پیر — کہ از و کار تست نظم پذیر
گرچہ پیرت منہم براہِ خدا — لیک من کردم از حق استدعا
کہ بفقرت چو من کمر بستم — او ترا دستگیر د از دستم

(وطن لوٹنے سے پہلے حسب ارشاد میں تمہیں پیر علی ہجویری کے سپرد کر رہا ہوں، میں نے خُدا سے دعا کی تھی کہ اب حسین کی تربیت حضرت علی ہجویری کریں اور میری یہ دُعا منظور ہو گئی ہے، حضرت علی ہجویری ولایت لاہور کے پیر ہیں، خدا رسیدہ ہیں، وہ تمہاری ہر خواہش اور مراد پوری کریں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اب وہی تمہارے کردار کی تکمیل کریں گے اور تمہیں خدا آشنا کریں گے۔)

شیخ بہلول حسین کو یہ پند و نصائح کرنے کے بعد اپنے وطن روانہ ہوئے اور حسین نے داتا گنج بخش علی ہجویری کے مرقد پہ بے مثال ریاضت شروع کر دی۔ ۔ ۔ ۔ شاہ حسین کا گھر حضرت داتا کے مزار سے زیادہ دور نہ تھا۔ پیر مکی یا داتا دربار اور ٹکسالی دروازے کے درمیان شاہ حسین محلّہ ٹھوگا یا تلہ بھگہ میں رہا کرتے تھے۔ یہیں انہوں نے شیخ بہلول سے تعلیم و تربیت حاصل کی اور قریب ہی اس عظیم صوفی کا مرقد مل گیا جس کے در پہ عظیم الشان صوفیوں نے حاضری دی اور چلّہ کھینچا اور فیض حاصل کیا اور جس کے بارے میں اقبال نے کہا:

سیّدِ ہجویر، مخدومِ امم — مرقد او پیرِ سنجر را حرم

پاسبانِ عزتِ ام الکتاب　　　　از نگاہش خانۂ باطل خراب

خاکِ پنجاب از دمِ اُو زندہ گشت　　　　صبحِ ما از مہرِ اُو تابندہ گشت

مولانا سید محمد متین ہاشمی "سید ہجویر" میں لکھتے ہیں کہ جس وقت حضرت ہجویریؒ لاہور تشریف لائے لاہور میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی اور لازماً انہوں نے مساجد بھی تعمیر کرائی ہوں گی لیکن وہ مساجد زیادہ تر سرکاری خرچ سے تعمیر ہوئیں یا ممکن ہے کہ ان کی تعمیر میں عوام نے بھی حصہ لیا ہو لیکن حضرت ہجویری کی تعمیر کردہ مسجد کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے حضرت نے اپنے خرچ سے تعمیر فرمایا اور اکابر صوفیا نیز سنتِ نبوی کی اتباع کے تحت اس کی تعمیر میں خود بھی حصہ لیا۔ مفتی غلام سرور قادری لاہوریؒ نے مختلف تذکرہ نگاروں کے حوالے سے تعمیر مسجد کے سلسلے میں حضرت کی ایک کرامت بھی نقل کی ہے۔

"نقل ہے کہ جب حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے لاہور میں قیام فرمایا تو جہاں ان کی خانقاہ تھی وہاں ایک مسجد تعمیر کرائی اور اس مسجد کی بنیاد اور محراب اس وقت کی دیگر مساجد کے مقابلے میں کسی قدر جنوب کی طرف مائل رکھی۔ لاہور کے علمائے جو اس وقت ثقہ مانے جاتے تھے حضرت ہجویریؒ پر اعتراض کیا۔ مگر شیخ خاموش رہے۔ جب مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی تو ایک دن علمائے شہر کو جمع کیا اور خود امام بن کر اس مسجد میں نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد حاضرین سے فرمایا "دیکھ لیں کعبۃ اللہ کس جانب ہے۔ فوراً ہی درمیان کے تمام حجاب اٹھ گئے اور مسجد کے ٹھیک سامنے کعبہ نظر آنے لگا۔ تمام حاضرین نے اپنی ظاہری آنکھوں سے اس منظر کا مشاہدہ کیا۔"

گویا حضرت داتا صاحب کو بھی شہر لاہور میں سب سے پہلے ثقہ بند مولویوں اور عالموں کی تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ اور پھر اپنی غیر معمولی صلاحیت یعنی کرامت کا مظاہرہ کرنا پڑا لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ نصابی اور مذہبی فرائض ادا کرنے والے عالم اور مولوی صاحب عمل صوفیوں کی برتری کو تسلیم کریں۔

داتا گنج بخش غزنی سے ۴۳۱ھ میں لاہور آئے۔ اس وقت ان کی عمر پنتیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان سے پہلے ان کے پیر بھائی حضرت حسین زنجانی (میراں دی کھوہی) لاہور میں تبلیغ اسلام کے لیے تشریف لائے۔ حضرت علی ہجویری کو ان کے مرشد نے کہا کہ اب وہ لاہور جائیں اور وہاں ٹھکانہ کریں۔ داتا گنج بخش نے عرض کی وہاں میرے پیر بھائی حسین زنجانی موجود ہیں تب مرشد نے فرمایا "تمہیں چوں چراں سے واسطہ۔ بلاتوقف چلے جاؤ" حضرت داتا صاحب لاہور میں رات کے وقت پہنچے اور فصیل شہر سے باہر رات گزاری۔ جب صبح شہر میں داخل ہونے لگے تو دیکھا لوگ حسین زنجانی کا جنازہ اٹھائے لئے جاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

داتا گنج بخش جس نوعیت کی تعلیم و تربیت سے متصف تھے اس کا اندازہ لگانے کے لئے کسی بیرونی شہادت کی بجائے اندرونی شہادت پر انحصار زیادہ بار آور ہوگا۔ داتا صاحب نے اپنے اساتذہ کے بارے میں جو کہا ہے اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ خود داتا صاحب کے فکر و عمل کی سمتیں کیا تھیں۔ حضرت ابوالعباس بن محمد اشقانی کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"اپنے عہد کے امام یکتا اور راہِ طریقت میں یگانہ تھے۔ علم اصول و فروع میں امام اور بلند معانی کے حامل بہت سے مشائخ کو دیکھا تھا اور بذاتِ خود اجلہ اہل تصوف میں تھے۔ اپنی راہ کو فنا سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کی عبارت مغلق ہوا کرتی تھی۔ جاہلوں کے ایک گروہ نے ان کی عبارت کی تقلید کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ان کی تقلید میں جو عبارتیں لکھی گئیں وہ پراگندہ ہوتی تھیں، مجھے ان سے بڑا انس تھا، اور وہ بھی میرے اوپر سچی شفقت فرماتے تھے۔ بعض علوم میں وہ میرے استاد تھے جب تک میں ان کے پاس رہا کسی کو ان سے زیادہ شریعت کا احترام کرتے نہ دیکھا اور وہ تمام موجودات سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ امام محقق کے سوا کسی کو ان سے فائدہ نہ پہنچا تھا۔ ان کی طبیعت ہمیشہ دنیا و عقبےٰ سے متنفر رہتی تھی۔۔۔۔ مقامات و کرامات محض حجاب و آنمائش ہیں۔ آدمی اپنے حجاب کا عاشق ہو، دیدار کی آرزو حجابات کے آرام سے بہتر ہے صرف حق جل و علا کی ہستی ہے کہ اس کے لئے عدم نہیں اگر میں ایسا نیست ہو جاؤں کہ پھر ہست نہ ہو

تو اس کی بادشاہت میں کون سا نقصان ہو جائے گا۔ اور یہی صحتِ فنا کا اصلی مقام ہے۔

"ایک دن میں شیخ اشقانی کے پاس آیا تو دیکھا کہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً عَبۡدًا مَّمۡلُوۡکًا لَّا یَقۡدِرُ عَلٰی شَیۡءٍ (یعنی اللہ تعالےٰ نے مملوک غلام کی مثال دی جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا) اور روتے ہیں اور پھر نعرہ لگاتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ اے شیخ یہ کیا حال ہے تو ارشاد فرمایا: گیارہ سال سے اس مقام پر ہوں لیکن آگے نہیں بڑھتا ہوں۔

اپنے ایک اور استاد شیخ ابو جعفر محمد بن المصباح الصید لانی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں وہ رؤسائے صوفیہ میں تھے۔ تحقیق میں ان کی زبان اچھی تھی، حسین بن منصور سے بہت محبت کرتے تھے۔

شیخ ابو القاسم عبدالکریم بن ہوزان القشیری کو استاد کہتے ہوئے لکھتے ہیں "اپنے دور کے بے مثال اور نادر روزگار لوگوں میں تھے ان کی بزرگی اور جلالتِ شان کا زمانہ معترف ہے وہ ہر فن میں خاص فضیلت کے مالک تھے ان کے لطائف و نکات بہت ہیں۔ صوفی کے بارے میں ان کا ایک جملہ داتا صاحب نے یوں لکھا ہے "صوفی کی مثال برسام کے مریض کی سی ہے کہ ابتدا میں اس کی ہذیانی کیفیت ہوتی ہے اور آخر میں جا کر خاموش۔ جب اس کو تمکن و رسوخ حاصل ہو جاتا ہے تو پھر گونگا ہو جاتا ہے۔"

شیخ ابو القاسم بن علی بن عبداللہ الگرگانی کے بارے میں لکھتے ہیں "اور انہی میں قطبِ زمانہ حضرت ابو القاسم اپنے وقت میں عارف بے نظیر اور اپنے زمانے میں بے مثال صوفی گزرے ہیں آپ کا ابتدائی دور بھی بڑا پاکیزہ ہے اور مجاہدے کے لئے آپ نے جو سفر اختیار کئے وہ بہت کامیاب ہوئے۔ ایک دن میں حضرت گرگانی کی خدمت میں حاضر تھا اور جو لطائف میرے اوپر منکشف ہوئے تھے میں ان سے عرض کر رہا تھا تاکہ ان کی ہدایات کے مطابق اپنے احوال درست کر سکوں۔ اس لئے کہ آپ ناقدِ وقت تھے۔ حضرت میرا حال بڑے ادب و احترام سے سن رہے تھے۔ میرا لڑکپن اور جوشِ جوانی اپنے حال کے بیان پر حریص بنا رہا تھا۔ عین اسی حالت میں میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ جو لطائف میرے اوپر گزر رہے ہیں شاید اس قدر لطائف اس مرد

بزرگ پر نہیں گزرے۔ یہی وجہ ہے کہ رات نے احترام اور غور سے میرے احوال سُن رہے ہیں، شیخ بذریعہ کشف میرے اس خیال سے مطلع ہو گئے اور فرمایا جانِ پدر۔ میری یہ فروتنی اور احترام صرف تیرے لئے نہیں ہے بلکہ میں تو ہر مبتدی سے جو اپنا حال بیان کرتا ہے اسی احترام سے اس کے احوال سُنتا ہوں۔" جب میں نے آپ سے یہ بات سُنی تو میں خاموش ہو گیا۔ انہیں میری باطنی کیفیت کا اندازہ ہو گیا۔ فرمایا "جانِ پدر! انسان کو طریقت میں اس سے زیادہ نسبت نہیں ہوتی کہ جب وہ اس طریق کو اختیار کر لیتا ہے تو پھر دوسری طرف رجوع نہیں کرتا اور جب وہ معزول ہو جاتا ہے تو اسی تصور کو یاد کرتا رہتا ہے۔" میرے اور ان کے درمیان (طریقت) کے بہت سے راز و نیاز تھے۔"

ابواحمد المظفر بن احمد بن حمدانؒ کے بارے میں کشف المحجوب میں فرماتے ہیں۔ "شیخ المشائخ ابوسعیدؒ نے فرمایا کہ ہمیں بندگی کے ذریعے راہِ طریقت ملی لیکن خواجہ مظفر کو یہ راہ خواجگی کے ذریعے میسر ہوئی یعنی ہم نے مشاہدہ مجاہدہ کے ذریعے حاصل کیا اور حضرت خواجہ مظفر مشاہدے سے مجاہدے کی طرف آئے۔"

ایک دن میں (علی ہجویری) ان کے ہاں سخت گرمی میں پریشان بالوں اور پسینے میں شرابور کپڑوں کے ساتھ پہنچا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر فرمایا "ابوالحسن کیا چاہتے ہو۔ میں نے عرض کیا "سماع" اس وقت آپ کے حکم سے قوال حاضر ہو گئے اور ان کے ساتھ ایک جماعت اہلِ عشرت کی بھی آ گئی۔

جب سماع شروع ہوا تو مجھ پر بڑی بے قراری طاری رہی جب میرا جوش و خروش ختم ہوا تو آپ نے پوچھا "سماع کا مزا کیسا رہا" میں نے عرض کیا شیخ میرے لئے تو بہت اچھا رہا۔ آپ نے ارشاد فرمایا ایک وقت ایسا آنے گا کہ سماع اور کوے کی آواز تیرے لئے یکساں ہو جائے گی سماع میں قوت اس وقت تک ہے جب تک مشاہدہ نہیں ہو گا اور جب مشاہدہ ہو جائے گا یہ شوقِ سماع جاتا رہے گا۔ خیال رکھنا اس سماع کی عادت نہ ڈال لینا اور کہیں یہ طبیعت ثانیہ بن کر تجھے مشاہدے سے محجوب نہ کر دے۔"

حضرت داتا گنج بخش نے اپنے پیرو مرشد اور ان کے پیروں کے بارے میں جو لکھا ہے مختصراً

یوں ہے۔

"اور انہی اولیاء میں حضرت شیخ عباد ابو الفضل حسن بن محمد بن حسن ختلیؒ ہیں طریقت میں میری پیروی اور اقتداء ان کے ساتھ ہے وہ علم تفسیر و حدیث کے زبردست عالم تھے اور طریقت میں مسلک جنید رکھتے تھے۔ آپ حضرت حصریؒ کے مرید اور ان کے رازدار تھے۔ حضرت ابو عمرو قزوینی اور ابوالحسن سالبہ کے ہم عصر تھے۔ ساٹھ سال عزلت میں گزار کر مخلوق سے گمنام ہو چکے تھے۔ آپ کا قیام زیادہ تر جبل لکام میں رہا۔ طویل عمر پائی۔ آپ کی آیات و براہین ولایت بہت ہیں۔ مگر آپ صوفیانہ لباس اور رسم و رواج نہیں رکھتے تھے اور رسمی چیزوں کے سخت خلاف تھے۔ میں نے اس اللہ والے سے بڑھ کر کسی کو بارعب نہیں دیکھا۔ آپ کو میں نے یہ ارشاد فرماتے سنا کہ:

الدنیا یوم و لنا فیہ صوم دنیا کی زندگی ایک دن کے مثل ہے اور اس دن میں ہمارا روزہ ہے یعنی اس دنیا میں ہم نے کوئی حصہ نہیں لیا اور ہم اس کے جال میں نہیں پھنسے۔ اس لئے اس دنیا کی آفتیں ہماری دیکھی ہوئی ہیں اور ہم اس کے حجابات سے واقف ہیں۔

ایک دن میں انہیں وضو کراتے ہوئے ان کے ہاتھ پر پانی ڈال رہا تھا کہ میرے دل میں خطرہ گزرا کہ جب تمام نظام عالم اور دنیوی کاروبار قسمت پر مبنی ہے تو کس لئے اچھے خاصے لوگ کرامت اور فیض کی امید میں خود کو پیروں کا غلام بنا لیتے ہیں؟ میرے دل میں اس خیال کا آنا تھا کہ حضرت ختلیؒ نے فرمایا کہ بیٹے! جو خیال تمہارے دل میں گزرا ہے مجھے معلوم ہے۔ یاد رکھو کہ قضا و قدر کے ہر حکم کے لئے اللہ تعالٰی نے اسباب مقرر کر رکھے ہیں جب اللہ تعالٰی چاہتا ہے کہ سپاہی زادے کو تاج معرفت اور مملکت عشق کی حکمرانی بخشے تو اسے توبہ کی توفیق دے کر اپنے کسی مقرب بندے کی خدمت میں مشغول فرما دیتا ہے تاکہ وہ خدمت گزاری اس کی عزت و کرامت کے لئے سبب بنے یہ اور اس قسم کے بہت سے لطائف ہر روز میرے اوپر ظاہر ہوتے رہتے تھے۔

حضرت اپنی وفات کے دن بیت الجنّ میں تھے یہ ایک گاؤں دمشق اور بانیار کے درمیان ایک گھاٹی میں واقع ہے آپ کا سر مبارک میری گود میں تھا۔ اس زمانے میں میرا دل اپنے ایک پیر بھائی

سے رنجیدہ تھا اور عام طور پر ایسا ہوا کرتا ہے۔ حضرت مجھ سے فرمانے لگے بیٹا! میں تمہیں ایک عقیدہ بتلاتا ہوں اگر تم اس پر جم گئے تو دنیا کے ہر غم و اندوہ سے آزاد ہو جاؤ گے۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ اور ہر وقت اچھوں اور بروں کو پیدا کرتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی کسی چیز سے نفرت نہ کریں اور کسی کی طرف سے اپنے دل کو رنج نہ رکھیں اس وصیت کے بعد اور کچھ نہیں فرمایا اور آپ کا وصال ہو گیا۔

داتا صاحب کے مرشد حسن ختلیؒ کے مرشد الحصری البصری تھے اور ان کے مرشد حضرت ابوبکر شبلیؒ تھے جن کے بارے میں داتا صاحب نے کشف المحجوب میں لکھا ہے "حضرت ابوبکر دلف بن جحدر شبلیؒ اکابر مشائخ میں گزرے ہیں۔ بڑے خوش وقت تھے کسی (ابوالفضل جعفری بن یحییٰ بن خالد برمکی) نے کہا ہے "تین چیزیں عجائباتِ عالم میں سے ہیں۔ شبلی کے ارشادات، مرتعش کے نکات اور جعفر کی حکایات۔ آپ قوم کے بڑے لوگوں میں سے تھے شبلی کا شمار ساداتِ طریقت میں ہوتا ہے۔ ابتدا میں آپ دربارِ خلافت میں حاجب تھے خیر النساج کی مجلس میں آپ نے توبہ کی اور حضرت جنید بغدادیؒ سے طریقت کا تعلق قائم کر لیا۔ آپ کا ایک واقعہ مروی ہے کہ ایک دن آپ بازار سے جا رہے تھے تو لوگوں نے آوازہ کسنا شروع کر دیا "یہ پاگل ہے"۔ آپ نے فرمایا۔ میں تمہارے نزدیک پاگل ہوں اور تم میرے نزدیک دنیوی مفادات کمانے کے اعتبار سے ہوشیار۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے جنون اور تمہاری ہوشیاری میں اضافہ کر دے اور پھر فرمایا "یہ کیسے لوگ ہیں جو جنون اور عشق الٰہی میں فرق و امتیاز برتنے کی صلاحیت سے محروم ہیں؟"

حضرت داتا گنج بخش نے اپنے استادوں اور بزرگوں کے حوالے سے تصوف اور دوسرے جو نکات واضح کیے ہیں ان سے خود ان کی اپنی ذات کے بارے میں بہت سے دروازے کھل جاتے ہیں اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کیوں خواجہ معین الدین چشتی، بابا فرید الدین گنج شکر سے لے کر شاہ حسین تک اس مرقد پہ چلّے کاٹتے رہے اور عبادت کرتے رہے۔ شیخ بہلول نے کس خیال سے حسین کو داتا صاحب کے سپرد کیا اور کیوں حسین کو نصیحت کی کہ انہیں خدا تک لے جانے کا

کام علی ہجویری ہی کریں گے۔

محمد پیر نے جو تفصیل دی ہے اس کے مطابق شاہ حسین ایک طرح سے مستقل طور پہ حضرت داتا صاحب کے مزار پہ آ گئے اور شب و روز عبادت و ریاضت میں گزرنے لگے۔ مزار مبارک پہ تلاوت و نماز سے فارغ ہو کر وہ شہر سے باہر جنگلوں اور ویرانوں میں عبادت کے لئے نکل جایا کرتے تھے اور ہر رات دریائے راوی کے کنارے یا دریا میں کھڑے ہو کر پورا قرآن ختم کیا کرتے تھے۔ لیکن قرائن یہ کہتے ہیں کہ حضرت داتا گنج بخش کے مزار پہ عبادت کرنے کے علاوہ انہوں نے مجاہدہ اور مراقبہ کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور اس عہد کے لاہور کے بڑے بڑے استادوں صوفیاً اور عالموں سے بھی رابطہ رکھا۔ اس کا اظہار محمد پیر نے ایک دوسری جگہ کیا ہے جس میں بتایا ہے کہ حسین کو سید داؤد کرمانی شیر گڑھی سے بھی نیاز حاصل تھا اور ابو اسحاق قادری سے بھی خاصی یاد اللہ تھی اور شیخ سعد اللہ کے مکتب میں تو حسین باقاعدہ تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ حسین کے ان تعلقات کی بنیاد بھی ان کی کایا کلپ ہونے سے پہلے کی ہے۔

شاہ حسین نے اپنی زندگی کے ابتدائی چھتیس میں سے آخری چھبیس برس علم کے حصول میں گزارے اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ ان دنوں میں انہوں نے خود بھی کسی مکتب میں درس دینے کا کام شروع کر دیا ہو کیونکہ ان کے والدین نے انہیں اچھی تعلیم کے لئے مولوی ابوبکر گھوی کے سکول میں تو داخل کرا دیا تھا مگر غالباً وہ یہ توقع نہیں کرتے ہوں گے کہ حسین چھتیس برس تک ان پر بوجھ بنے رہیں وہ خود بھی کوئی ایسے امیر کبیر لوگ نہ تھے اور کپڑا بُن کر گزر بسر کیا کرتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حسین نے ان دنوں خود بھی کپڑا بُننے کا کام کیا ہو کیونکہ عبدالقادر بدایونی "نجات الرشید" میں حسین کو ایک بافندہ یعنی جولاہے ہی کے حوالے سے یاد کرتے ہیں جس سے لگتا ہے کہ حسین بھی اسی زمانے میں کپڑا بُننے کا کام کیا کرتے تھے اس لئے نہ صرف دوسرے لوگ انہیں جولاہا کہا کرتے تھے بلکہ وہ خود بھی اپنے آپ کو جولاہا کہا کرتے تھے اور شاعری میں انہوں نے خود کو جولاہا کہا ہے

انی حسینو جولاہا

ناڈں حسین تے ذات جولاہا طعنے دیندیاں تانی والیاں

بہر طور داتا صاحب کی درگاہ پہ حسین نے بارہ برس گزار دیئے۔ کڑی عبادت کی، داتا کے دربار پہ آنے والے مختلف علاقوں کے بزرگوں سے بھی فیض پایا ہوگا اور داتا صاحب کی تصنیف کشف المحجوب سے بھی راہِ تصوف کے مشکل مراحل سے آشنائی حاصل کی ہوگی۔ اس ضمن میں ہم داتا صاحب اور دوسرے بزرگوں کے بعض ایسے اقوال سے درگزر نہیں کر سکتے جن کے بارے میں یہ گمان گزر سکتا ہے کہ انہوں نے شاہ حسین کی زندگی پر براہِ راست اثر ڈالا ہوگا۔

- وہ علم جس پر عمل نہ کیا جائے انسان کے لئے باعثِ وبال ہے۔
- صحیح عالم وہ ہیں جو علم کو دنیوی وجاہت حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بناتے یہی وہ لوگ ہیں جن کا علم مقامات کا مشاہدہ کراتا اور معرفت کے دروازے کھول دیتا ہے۔
- جس نے علم کلام اور علم العقائد پہ اکتفا کی اور زہد نہ اختیار کیا آخر کار وہ زندیق ہو جائے گا۔ اور جس نے فقہ پہ اکتفا کی اور زہد و ورع اختیار نہ کیا وہ فاسق ہو جائے گا۔
- فقیر وہ ہے جو اسباب پہ بھروسہ کرے نہ اسباب کو جمع کر کے رکھے اسباب کا ہونا نہ ہونا اس کی نظر میں برابر ہو اس لئے اس کی نظر اسباب پہ نہیں بلکہ مسبب الاسباب پہ ہوتی ہے۔
- بدترین انسان وہ ہے جسے لوگ اللہ والا سمجھیں اور وہ درحقیقت ایسا نہ ہو اور وہ اس بات سے خوش ہوتا ہو اور بہترین انسان وہ ہے جسے لوگ مرد خدا جانیں اور وہ حقیقت میں اللہ والا ہو اور افضل ترین وہ شخص ہے جسے لوگ مردِ کامل نہ سمجھیں مگر درحقیقت وہ ولی کامل ہو۔ تیسری صورت اس لئے افضل ترین ہے کہ اس میں اخفا ہے اور دیارِ عشق میں اخفا ہی سب سے بڑی دولت ہے۔
- بشریت کے باعث انسان تکدر میں ہے صوفی وہ ہے جو حقیقت تکدر سے گزر کر صفاتِ بشریت پہ غلبہ حاصل کرے اس وقت بشریت فنا ہو جاتی ہے۔
- صوفی وہ ہے جو اپنے وجود سے فانی ہو کر باقی الحق ہو جائے اور مزاج و طبیعت کی قید

سے آزاد ہو کر حقیقۃ الحقائق سے مل جائے۔

- متصوف وہ ہے جو اس درجے کے حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے اس طرح کے لوگ صوفیائے کرام کے طریق کی مکمل پیروی میں لگے رہتے ہیں۔
- مستوصف وہ ہے جو دنیوی متاع کے حصول کی خاطر صوفیہ کے اعمال وافعال کی نقل کرتا ہے وہ صوفیاء کے قول دہراتا ہے حالانکہ اسے کچھ بھی خبر نہیں ہوتی۔
- تصوف مستقل طور پر بندے سے مجاہدے کا تقاضا کرتا ہے اور بندے کی شان یہی ہے کہ وہ استقامت کے ساتھ راہِ مجاہدہ پر قائم رہے۔
- ابوالحسن نوری کے بقول صوفی متاعِ دنیا میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا نہ وہ خود کسی کا مملوک ہوتا ہے اس لئے اسے خلق سے کامل انقطاع نصیب ہو جاتا ہے۔
- طریقِ ملامت تو وہ شخص اختیار کرتا ہے جو پہلے مقبول بارگاہ الٰہی ہو چکا ہو۔
- ترکِ شریعت پر جب لوگوں کی ملامت کی گئی تو وہ بھڑک اٹھے حالانکہ اگر صحیح معنوں میں وہ ملامتی ہوتے تو خوش ہوتے کہ ان کی مراد پوری ہو رہی ہے۔
- صوفیاء کا ایک گروہ وہ ہے جو اللہ تعالےٰ کی عطا پر راضی. یہ حق ہے یہ معرفت کا درجہ رکھتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اللہ تعالےٰ کی نعمتوں پر راضی ہے۔ یہ دنیوی درجہ ہے، تیسرا گروہ وہ ہے جو ہر بلا پر راضی ہے یہ درجہ مجاہدہ ہے۔ چوتھا وہ گروہ ہے جو اصطفا پر راضی ہے یہ درجہ محبت ہے۔
- کرامت دراصل صداقت ولایت کی دلیل ہوتی ہے۔ کاذب سے اس کا صدور محال ہے۔ کرامت ایسے فعل کا نام ہے جو عادت و عقل کے خلاف اللہ تعالےٰ کے کسی بندے سے صادر ہو۔
- معجزہ میں اظہار شرط ہے جبکہ کرامت میں کتمانِ کرامت شرط ہے۔
- کرامت کا صادر کرنا ولی کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ بعض اوقات جب وہ کرامت صادر

کرنا چاہے صادر نہیں ہوتی اور بعض اوقات غیر اختیاری طور پہ اس سے کرامت صادر ہو جاتی ہے۔

- اگر کسی کافر اور فاسق و فاجر سے کوئی امر خارق عادت صادر ہو تو اسے استدراج کہتے ہیں۔
- جو شخص از خود غائب نہیں ہوگا حاضر بحق ہرگز نہیں ہو سکتا۔
- سوال صرف اللہ تعالےٰ ہی سے کیا جائے اس میں فقر کا وقار اور درویشی کی عزت ہے بندے میں توکل کی صفت اسی سے پیدا ہوتی ہے۔
- جو درویش خلقت کی صحبت اختیار کرے اس کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ نکاح کرے اور جو عزلت گزیں ہو اسے مجرّد رہنا بہتر ہے۔
- مجاہدہ واقعتاً علتِ مشاہدہ ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو شریعت نزولِ کتب سماویہ اور بندوں پہ احکام نازل کر کے ان پہ عمل کو واجب قرار دینا یہ تمام چیزیں باطل ہو جائیں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ دین اور احوالِ آخرت کے تمام احکام کسی نہ کسی علت کے ماتحت ہیں تو علت کی نفی کر دی جائے تو تمام احکام اُٹھ جائیں گے پھر یہ دنیا عالم اسباب ہے جب ہم بھوکے ہوتے ہیں تو کھانا کھاتے ہیں پیاس کو رفع کرنے کے لئے پانی پیتے ہیں تو مشاہدے کے لئے مجاہدے کو علت قرار دینے میں کیا مضائقہ ہے؟ افعال میں اسباب دیکھنا توحید ہے اور اسباب کو ساقط قرار دے دینا تعطیل ہے؟

شاہ حسین نے شیخ بہلول کے ارشاد کے مطابق پیر علی ہجویری کے مزار پہ بارہ سال حاضری دی، خدمت کی، عبادت کی، ہر روز ایک قرآن شریف پڑھا اور اس لئے کہ کوئی راہِ ہدایت ملے، کوئی ایسا وسیلہ جو حسین کو اصل بارگاہ میں پہنچا دے اور حسین فریاد کرتے رہے۔

عاشق ہوویں تاں عشق کماویں

راہ عشق کا سوئی دا نکا دھاگہ ہوویں تاں جاویں

باہر پاک اندر آلودہ، کیہا توں شیخ کہاویں

کہے حسین جے فارغ تھیویں تاں خاص مراتبہ پاویں

(اگر تم سچے عاشق ہو تو واقعی عشق کماتے، عشق کا راستہ تو سوئی کا ناکہ ہے کہ جس میں سے گزرنے کے لئے دھاگہ بننا پڑتا ہے، تم باہر سے پاک صاف ہو مگر اندر آلودگی ہے اس پر بھی شیخ کہلاتے ہو، حسین اگر اس اندر کی آلودگی سے نجات ہو تو پھر ہی خاص مرتبہ مل سکتا ہے)۔

اور پھر ایک دن رمضان کا مہینہ جمعتہ المبارک:

پیکرے خوش ز نورِ ربانی — مظہرِ نورِ پاک رحمانی

دید روئش حسین وشد سرمست — رفتش از بے خودیٔ غائت است

گشت از دیدنش چوں مست حسین — بے خود از جائے خویش جست حسین

از ارادت فتاد در پائش — سرِ خدمت نہاد در پائش

(داتا کی قبر سے ایک پیکر نور ابھرا، خدائی نور کا مظہر، حسین نے دیکھا اور مست ہو کر اس کے پاؤں پر سر ڈال دیا)

ہوش آیا تو پوچھا کون ہے۔ جواب ملا علی ہجویری، اور کہا تو نے بارہ برس ہماری خدمت کی، تو ولی کامل ہو گیا۔ اب تو جو کہے گا وہی ہو گا۔

پیر علی ہجویری یہ مژدہ سنانے اور حسین کی پیٹھ تھپ تھپانے کے بعد آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ شیخ بہلول جس مقصد کے لئے حسین کو علی ہجویری کے مزار پر چھوڑ گئے تھے وہ پورا ہو گیا تھا اور حسین جس کی تلاش میں تھے وہ بھی کسی حد تک حاصل ہو گیا تھا مگر حسین نے نہ اس کا اعلان کیا نہ ولایت سنبھالی بلکہ وہ معمول کے مطابق داتا کے مزار پر قرآن پڑھتے رہے، نمازیں ادا کرتے رہے

اور ڈوڈو و وظائف کے مرحلوں سے بھی گزرتے رہے۔ دوسری طرف وہ اس عہد کے عالموں کے پاس سے بھی فیض حاصل کرتے رہے۔ باقاعدہ درس لیتے۔ اسی طرح ایک آدھ سال اور گزر گیا تا آنکہ زندگی کی چھتیس بہاریں گزریں تو اس اثنا میں وہ شیخ سعداللہ کے مدرسے سے یہ کہہ کر اٹھ آئے۔

ہسن کھیڈن بھاگ اساڈے دتا جی رب آپ اسانوں
اک روندے روندے گئے اک ہس رس لے گئے گوٹے میدانوں
کہے حسین فقیر سائیں دا، صحیح سلامت چلے جہانوں؛

یا : نی مائے سانوں کھیڈن دے میرا وت کھیڈن کون آسی

درگاہ وچ سہاگن سوای جو کھل کھل نچ کھلوئی

اساں اندر باہر لال ہے اساں مرشد نال پیار ہے
اساں ایہو ونج وپار ہے۔ اساں رل مل جھرمٹ پاؤنا

حسین نے وما الحیواۃ الدنیا الا لہو ولعب کا مطلب پا لیا تھا اور کہا۔

ہمارا مقدر ہنسنا کھیلنا ہے اور یہ خود رب کریم نے ہمیں مرحمت فرمایا ہے۔
اک اس جہان سے روتے روتے ناکام چلے گئے۔ دوسرے ہنستے موج مناتے بازی جیت گئے۔
اللہ کا فقیر حسین کہتا ہے ہم اس جہان سے صحیح سلامت رخصت ہو رہے ہیں۔

اور اے ماں ہمیں کھیلنے دے (یہ زندگی کھیلنے کا ہی نام ہے) ہمارا پھر کون کھیلنے

کے نشے آئے گا۔

اللہ کا قرب اسی کو حاصل ہو گا جو بڑی بے باکی سے رقص کرے گی۔

ہمارا اندر بھی لال ہے اور باہر بھی، ہمیں اپنے مرشد سے سچا پیار ہے۔
یہی ہمارا کاروبار حیات ہے اور ہم سب مل جل کر ناچ رہے ہیں۔

اور پھر حسین زاہد خشک کی طرح نہیں بلکہ ایک سرمست قلندر کی طرح پیر علی ہجویری کے مزار پر حاضری دیا کرتے تھے اور تحقیقات چشتی میں درج ہے۔

• طریقہ حضرت لال حسین کا مجذوبانہ اور قلندرانہ تھا وہ اسی راہ سے جہاں مکان حسو تیلی کا تھا (چوک جھنڈا) شور و غل کناں بمزار پیر علی مخدوم گنج بخش ہجویریؒ آیا جایا کرتے تھے:

شیخ سعد اللہ ۔۔۔۔ استاد ملامت

شاہ حسین کے استادوں میں شیخ سعد اللہ کا نام اس اعتبار سے بہت نمایاں ہے کہ ایک تو وہ اپنے عہد کے جید عالم تھے اور ایک بہت بڑے مکتب کے سربراہ۔ اس زمانے کی اعلیٰ ترین تعلیم (جیسے ہمارے عہد میں یونیورسٹی کی تعلیم کہا جاتا ہے)، دینے والوں میں شیخ سعد اللہ سربرآوردہ تھے۔ دوسرے شیخ سعد اللہ تصوف میں خاص مسلک رکھتے تھے جس کے بارے میں محمد اقبال مجددی نے طبقات اکبری میں سے مرزا نظام الدین احمد ہروی کا یہ جملہ دائرۃ المعارف اسلامیہ میں درج کیا ہے "بروش ملامتیہ سلوک مے نمود"

اسی شیخ سعد اللہ کے پاس شاہ حسین پڑھ رہے تھے اور جب "وما الحیوۃ الدنیا الا لھو ولعب" کی آیت آئی تو شاہ حسین نے اس سے وہ مطلب نکالا جس کے بارے میں دارا شکوہ نے لکھا ہے "(شاہ حسین) قرآن کا حافظ تھا اور آیتوں کے عجیب و غریب معانی بیان کرتا تھا" حقیقت الفقرا میں ہے :۔

ہم بداں آگہی و کشف و عطا　　بود در اکتساب علم خدا
بود استادِ آں خدا آگاہ　　اندریں علم شیخ سعد اللہ

شیخ بود ست عالم و عامل — در فقاہت یگانہ و کامل
فاضلِ علم و فضل را بانی — ہم محقق ز پس خدادانی
خواندی از وے حسین آں تفسیر — کہ مدارک نخواند شش تحریر
اپتے در رسید در سبقش — کہ ز معنی نمود رہ بحقش

مگر سالک صاحب کا خیال ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ دوسری طرف "حقیقت الفقرا" میں شاہ حسین کے ان بزرگوں کو بنی اسرائیل کہا گیا ہے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔

شاہ فیروز ختم پادشہاں — شیخ دادش خطاب دراقراں
شیخ چوں آمدش لقب بے قیل — در نسب شُد "بنی اسرائیل"
زانکہ نو مسلم از رہِ ایماں — شیخ باشد برآں مسلماناں

اس اعتبار سے شیخ یا شاہ حسین بھی بنی اسرائیل تھے اور ان کے استاد شیخ سعد اللہ بھی اسی قبیلے سے متعلق تھے۔ سالک صاحب لکھتے ہیں "شیخ سعد اللہ کے والد ملتان کے مولانا فتح اللہ دانشمند تھے۔ آپ نے اکثر علوم اپنے والد سے حاصل کئے جب وہ فوت ہو گئے تو علم کا شوق انہیں کشاں کشاں دیپالپور لے گیا جہاں آپ شیخ بایزید کے درس میں شریک ہوئے۔

محمد اسحاق بھٹی فقہائے ہند، جلد سوم میں لکھتے ہیں۔ "مولانا سعد اللہ بن ابراہیم بن فتح اللہ ملتانی ۹۲۱ھ میں ملتان میں پیدا ہوئے بعض کتب درسیہ اپنے والد شیخ ابراہیم سے پڑھیں اور ۹۳۲ھ تک ان سے انسلاک و وابستگی اختیار کئے رکھی۔ والد کی وفات ۹۳۲ھ میں ہوئی۔ اسی سال یا اس سے کچھ عرصہ بعد ملتان سے لاہور آ گئے وہاں شیخ عبدالرحمٰن بن عزیز اللہ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ بختاور خان (مرآۃ العالم) کی روایت کے مطابق علم حاصل کرنے کے بعد شیخ بایزید دیپالپوری کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ اٹھتر سال کی عمر پا کر ۹۹۹ھ میں وفات پائی۔

سید محمد حیدر" احوال الشیخ داؤد جھنی وال" میں لکھتے ہیں "مرزا کامران نے دیپالپور میں مُلّا بایزید کو ایرانی عالم سے مناظرے کے لئے، بلا بھیجا۔ شیخ داؤد ان مُلّا بایزید کے شاگرد تھے

وہ اس مناظرے کی تیاری میں استاد کی معاونت کر رہے تھے"۔

مُلّا بایزید، شیخ داؤد کرمانی شیر گڑھی، شیخ سعد اللہ لاہوری اور شاہ حسین میں اس طرح سے ایک یقینی رابطہ بنتا ہے۔

جب شیخ سعد اللہ نے دیپالپور سے سندِ فضیلت حاصل کر لی تو آپ لاہور واپس آ گئے اور درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ اس دوران آپ نے شیخ حسین کاکو کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی توجہ سے سلوک کی منازل طے کیں۔ بختاور خان صاحبِ "مراۃ العالم" لکھتا ہے "بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آپ کتبِ سلوک کا درس دے رہے ہوتے تو آپ پر حالت طاری ہو جاتی اور آپ دنیا مافیہا سے بے خبر ہو جاتے اور دو دو تین تین دن یہی حالت طاری رہتی۔ کھانا پینا حتیٰ کہ نماز تک چھوٹ جاتی۔ جب آپ حالتِ صحو میں آتے تو خادم سے قضا شدہ نمازوں کی تعداد پوچھتے انہیں ادا کرتے اور درس و تدریس کے محبوب مشغلے میں محو ہو جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ پر روحانی غلبہ کی حالت میں ایک کیفیت طاری ہوتی۔ آپ چپ چاپ آباؤ اجداد کی قبروں کی طرف نکل جاتے کسی ٹوٹی ہوئی قبر میں کپڑا اوڑھ کر لیٹ جاتے۔

جن ایام میں اکبر نے اجتہاد کا دعوےٰ کیا اس نے دیگر علماء کے ساتھ آپ کو بھی اپنے حضور طلب کیا۔ آپ پالکی میں سوار ہو کر وہاں پہنچے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بعض موضوعات پر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ اکبر نے آپ سے پوچھا انسان واصل بالحق کیسے ہوتا ہے؟ آپ نے جواب دیا "جیسے میں آپ کی خدمت میں پہنچ گیا"۔ بادشاہ نے کہا یہ جواب بڑا مبہم ہے اس کی وضاحت کیجئے آپ نے جواب دیا آپ کے اور بندے کے درمیان طبقۂ امراء ایک طرح سے وسیلہ ہے۔ میں نے وسیلہ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر آپ تک نہ پہنچ سکا۔ اب آپ نے خود بُلا لیا ہے اور میں بغیر کسی وسیلے کے آپ سے واصل ہو گیا۔ اس طرح انسان لاکھ کوشش کرے کہ واصل بالحق ہو جائے لیکن جب تک حق تعالےٰ نہ چاہے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا اور جب اللہ تعالےٰ کی طرف سے طلب ہو تو وہ مقصد کو پا لیتا ہے اور واصل بحق ہو جاتا ہے"۔ بادشاہ نے بڑے اعزاز

احترام سے آپ کو رخصت کیا۔ جب آپ چلے آئے تو بادشاہ نے اپنے مقربین سے کہا کہ اس مردِ خاص سے سلفِ صالحین کی بو آتی ہے۔

شیخ سعد اللہ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ درس و تدریس اور تقویٰ و طہارت میں بسر کیا۔ مگر بڑھاپے کے عالم میں ایک سخت حادثہ پیش آیا۔۔۔۔آپ کسی مطربہ پہ عاشق ہو گئے اور درس و تدریس کا سلسلہ ختم کر کے رندانہ زندگی اختیار کر لی۔ شیخ کے بے شمار شاگرد تھے انہوں نے شیخ کی اصلاح کی کوشش کی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ شہر کا محتسب بھی ان لوگوں میں شامل ہو گیا۔ مُلّا بدایونی کہتے ہیں "ایک دن آپ اس مطربہ کے ساتھ شراب پی رہے تھے کہ محتسب اور طلبہ کی جماعت اکٹھی ہوئی اور دیوار پھاند کر اس مکان میں داخل ہو گئی جہاں یہ محفلِ ناؤ نوش جاری تھی۔ انہوں نے تمام آلاتِ طرب توڑ دیئے۔ وہ شیخ سعد اللہ کو گرفتار کرنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ شیخ نے کہا "اگر میں نے ایک غیر شرعی فعل کا ارتکاب کیا ہے تو تم تین افعال کے مرتکب ہوئے ہو۔ اول بغیر اجازت دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے ہو، دوسرے تم نے اس سلسلے میں تجسس سے کام لیا جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی، تیسرے دروازے کو کھٹکھٹائے بغیر یہاں چلے آئے ہو۔ تم میری نسبت سزا کے زیادہ مستحق ہو۔

وہ جماعت شرمندہ ہو کر چلی گئی۔ آپ کو اللہ تعالےٰ نے توبہ کی توفیق دی ایک مرتبہ پھر آپ حلقۂ درس میں آئے۔ اس کے بعد جتنا وقت بچتا، عبادت اور ریاضت میں بسر کرتے۔ آپ کی بہت سی تصانیف میں امام غزالی کی کتاب جواہر القرآن کی شرح خاص طور پر مشہور ہے۔ مُلّا بدایونی لکھتے ہیں "مجھے آپ سے پہلی مرتبہ لاہور میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے آپ سے ملتان کی ویرانی لاہور کی آبادی، ملتان کے سلاطین لنگاہ خاص کر سلطان حسین لنگاہ کے بارے میں کچھ سوالات کئے۔ آپ نے ان سوالوں کے جواب بڑی فصاحت و بلاغت سے دیئے۔ مجھ پر ان باتوں کا بڑا اثر ہوا۔

شیخ سعد اللہ ہاتھ کے سخی اور دل کے نرم تھے کبھی کوئی سائل آپ کے در سے خالی نہیں گیا

تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ آپ معاش کے تمام ظاہری اسباب سے محروم تھے۔ بادشاہ نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ آپ مددِ معاش قبول کریں مگر آپ نے ہر بار انکار کر دیا۔ بدایونی کے بقول آپ تقریباً اسی برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ مراۃ العالم کے بختاور خان کے مطابق ۹۲۱ھ (۱۵۱۵ء) میں پیدا ہوئے اور ۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء میں جب شاہ حسین کی عمر چون برس تھی انتقال کیا۔

شیخ سعد اللہ کے شاگردوں میں شاہ حسین کے علاوہ میاں میر بھی تھے۔ شیخ منور لاہوری شیخ سعد اللہ کے بھانجے اور شاگرد تھے۔ آپ نے اکبر کے حکم سے معجم البلدان کا ترجمہ فارسی میں کیا جس میں مُلّا احمد ٹھٹھوی اور قاسم بیگ آپ کے شریک تھے۔ دین الٰہی سے اختلاف کے باعث قید ہوئے۔ قلعہ گوالیار میں ۱۰۱۱ھ میں انتقال کیا یعنی شاہ حسین کی وفات کے تین سال بعد۔

مُلّا عبد السلام لاہوری بھی شیخ سعد اللہ کے شاگرد تھے۔ اپنے عہد کے بہت بڑے استاد۔ مُلّا نظام الدین طبقات اکبری میں لکھتا ہے کہ "مُلّا عبد السلام لاہوری فحول علمائے لاہور بود"۔۔۔۔ حقیقت الفقرا میں مُلّا عبد السلام کو شاہ حسین کے خاص مریدوں میں شمار کیا گیا ہے جو شاہ حسین سے دو برس چھوٹے تھے یعنی ۹۴۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۳۷ھ میں انتقال کر گئے۔ محمد بیر دوستان حسین با اخلاص میں عبد السلام کو بھی شامل کرتا ہے۔

نیز عبد السلام دانش مند　　　کہ ز دانش بفقر شد خرسند

شیخ منصور لاہوری، شیخ سعد اللہ کے شاگرد اور داماد تھے۔ کچھ عرصہ مالوہ کے قاضی القضاۃ بھی رہے۔ پھر بھکر اور کوہستانی سرحدوں کے نظم و نسق پہ مامور کر دیئے گئے۔

آغاز ملازمت

ڈلا بھٹی ، علی کوتوال
ملا عبداللہ سلطان پوری
اکبر بادشاہ

اکبر، دُلا بھٹی اور علی کوتوال

حقیقت الفقراء کے مطابق اکبر بادشاہ نے شہر کے کوتوال ملک علی کو حکم دیا کہ شاہ حسین کو پکڑ کر اس کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ ملک علی نے شاہ حسین کو پکڑنے کی پوری کوشش کی۔ اپنی ساری پولیس شاہ حسین کی تلاش میں لگا دی۔ شاہ حسین شہر میں موجود ہونے کے باوجود پولیس کے ہاتھ نہیں آئے جس پر ملک علی بہت ناراض اور خفیف تھا، حکم شاہ کی بجا آوری میں تاخیر کے باعث پریشان تھا۔ چونکہ شاہ حسین کے خلاف اکبر کو بھڑکانے میں خود اس کا بھی ہاتھ تھا اس لیئے پریشانی دوچند تھی، پھر یہ خطرہ بھی تھا کہ شاہ حسین اگر اپنی غیر معمولی حرکات یا طاقت کی بنا پر اس کی گرفت میں نہیں آ رہا تو یہی بات کل کو شاہ حسین کی بریت میں معاون بھی ثابت ہو سکتی ہے۔۔ ملک علی شاہ حسین کو پکڑنے میں ابھی تک ناکام تھا کہ انہی دنوں بادشاہ نے علی کو حکم دیا کہ ساندل بار کے زیر حراست زمیندار دُلا بھٹی (عبداللہ) کو لاہور میں سرِ عام پھانسی دے دی جائے۔ پھانسی علاقہ نخاس (موجودہ لنڈا بازار سے محلہ دارا شکوہ تک) میں دی جائے۔ حقیقت الفقراء میں درج ہے۔

کز قضا ناگہ اندراں اثنا   گردشہ حکم کشتنِ دولا

بود دُلائے بھٹی آں طاغی   کز رہِ بغض بود او باغی

بود در بوم خود زمیندارے — مفسدے، رہزنے، ستمگارے
بارے گفتہ اند بومش را — بودش آں بار ملجا و ماویٰ
بود در بوم دبارِ خود مفرور — ہم بدزدی و رہزنی مشہور
بفرستاد شاہ اکبر زاں — بہ سرش از حضور، فوجِ گراں

دُلا بھٹی کے بارے میں اس تفصیل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ساندل بار میں اکبر بادشاہ کی حکمرانی کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کئے ہوئے تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کا باپ فرید اور دادا ساندل بھی مغلوں کے خلاف تھے اور ساندل بار کے علاقے میں حکمرانوں کے لئے مسائل کھڑے کیا کرتے تھے۔ فوج وقتاً فوقتاً ان کی سرکوبی کے لئے جاتی تھی۔ مگر عموماً ناکام ہو کر واپس آجاتی، اس خانوادے کو جو اپنے قبیلے کا سربراہ بھی تھا غالباً اکبر کے دنوں میں یہ اعتراض تھا کہ اس نے مسلمانوں کی روایتی بالادستی ختم یا کم کرنا شروع کی ہے اور ان کی جگہ غیر مسلموں کو سرکاری انتظامیہ میں زیادہ نمایاں جگہ دینا شروع کی ہے۔ اس طرح خود ان کی خاندانی حیثیت متاثر ہوتی ہے۔ اکبر کے دربار میں شکایت کرنے والوں میں بھی غیر مسلم ہی تھے۔ دُلا بھٹی کا طریق یہ تھا کہ بادشاہ کے لئے جو تحائف کشمیر، افغانستان اور دوسرے علاقوں سے لائے جاتے تھے وہ بھی لوٹ لیا کرتا تھا اور اس طرح اکبر کی حکومت کے لئے پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا۔

متذکرہ بالا فارسی اشعار میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ بادشاہ نے دُلا بھٹی کی سرکوبی کے لیے فوج بھجوائی اور لوک روایت بھی یہی بتاتی ہے کہ اکبر نے لاہور کے بخشی مرزا نظام الدین احمد ہروی (مصنف طبقات اکبری) کی سرکردگی میں فوج کو ساندل بار پر حملہ کرنے کے لیے کہا۔ دُلا بھٹی اور اس کے ساتھیوں کو اس حملے کا علم ہو گیا اس زمانے کی روایت کے مطابق بھٹی نے اپنے براہمن سے پتری نکلوائی جس نے بتایا کہ فوج کا مقابلہ سات دن بعد کرنا چاہیئے۔ اگر اسی دن مقابلہ کیا گیا تو نقصان کا اندیشہ ہے چنانچہ بھٹی اپنے ساتھیوں کو لے کر اپنے مرکز پنڈی بھٹیاں (تحصیل حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ) سے چنیوٹ

(ضلع جھنگ) میں اپنے ماموں کے پاس چلا گیا تاکہ سات دن بعد وہاں سے کمک لے کر فوج پر حملہ آور ہو۔

مرزا نظام الدین کی سرکردگی میں فوج ساندل بار کے جنگلوں میں سے ہوتی ہوئی پنڈی بھٹیاں کی طرف بڑھتی رہی، اسے غالباً کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور وہ پنڈی بھٹیاں میں جا پہنچی۔ جہاں دُلا بھٹی موجود نہیں تھا۔ اکبر کے بھٹی کے بارے میں سخت حکم کے سبب مرزا نظام الدین نے یہی مناسب سمجھا کہ بھٹی خاندان کی عورتوں خصوصاً بھٹی کی ماں لدھی اور اس کی بیوی اور بہنوں کو یرغمال بنا لیا جائے۔ یہ یرغمال بنا لی گئیں اور یوں مغل فوج اپنی نیم کامیابی کے شادیانے بجاتی واپس جانے لگی۔

ادھر چنیوٹ میں دُلا بھٹی کو پنڈی بھٹیاں کی صورتِ احوال کی خبر ملتی رہی جب اسے یہ پتہ چلا کہ بھٹی خاندان کی معزز خواتین کو قید کر لیا گیا ہے تو پھر اس سے نہ رہا گیا اور شبھ گھڑی کا انتظار کیے بغیر اس نے اچانک مغل فوج پر حملہ کر دیا اور اپنی خواتین کو آزاد بھی کرا لیا۔ لوک روایت کے مطابق اس نے مرزا نظام الدین پر بھی غلبہ پا لیا۔ مرزا نظام الدین نے اس سے صلح کر لی بلکہ اسے اپنا بھائی بنا لیا۔ مگر محمد پیر کے کہنے کے مطابق مغل فوج نے دُلا بھٹی کو گرفتار کر لیا اور اسے اکبر کے حضور پیش کیا گیا، جس نے دُلا بھٹی کو قید میں ڈال دیا۔

بھٹی کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ وہ مغلوں کے سخت خلاف تھا اور قید میں بھی اور تو کچھ نہیں کر سکتا تھا مگر مغلوں کو علی الاعلان گالیاں دیا کرتا تھا، یہ بھی خطرہ رہتا تھا کہ کہیں اس کا قبیلہ یا ہمدرد اسے جیل سے رہا نہ کرا لے جائیں۔ اس لیے لاہور کی انتظامیہ کی اپنی بقا کے لیے ضروری تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس کا خاتمہ ہو جائے چنانچہ ملک علی وغیرہ نے بادشاہ کے کان بھرے، ایک روایت کے مطابق ملک علی نے بھٹی کا نام لیے بغیر بادشاہ سے کہا کہ اگر کوئی شخص بادشاہ کے بارے میں اور دین کے بارے میں یوں کہے اور یوں کرے تو اس کی سزا کیا ہونی چاہیے۔ اکبر نے کہا کہ اسے قتل کر دینا چاہیے چنانچہ اس طرح بادشاہ کو خبر کیے بغیر بھٹی کو پھانسی پہ لٹکا دیا گیا۔ اسی روز بادشاہ کو علم ہو گیا کہ ملک علی نے بہانے سے بھٹی کے قتل یا پھانسی کی تصدیق کرائی تھی بادشاہ اس پر

ناراض ہوا اور اسی روز ملک علی کو بھی موت کی سزا دے دی۔

محمد پیر نے بڑی تفصیل سے ایک دوسری روایت بیان کی ہے۔ اس کے لکھنے کے مطابق جب بھٹی کو پھانسی دینے کے لیے نخاس میں لایا گیا اس وقت شہریوں کا بہت بڑا مجمع موجود تھا۔ حسین بھی اپنے مست الست ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچ گئے۔ اتفاقاً حسین کی نظر ملک علی کے بیٹے پر بھی پڑ گئی۔ حسین اُسے غور سے دیکھتے رہے، ادھر اُتنا ملک علی کو کسی نے خبر کر دی کہ حسین، بھٹی کو پھانسی دینے کا منظر دیکھنے والوں میں شامل ہیں اور اس وقت علی کے بیٹے کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔ ملک علی کا غصہ اور بھی بڑھ گیا۔ اس نے حسین کو زنجیر ڈالنے کا حکم دیا مگر جب زنجیر ڈالی جاتی حسین اُسے توڑ کر رکھ دیتے۔ ایک طرف یہ تماشا ہو رہا تھا دوسری طرف دُلا بھٹی سولی پر چڑھ کر بآواز بلند اکبر کو غلیظ گالیاں دے رہا تھا۔ علی کوتوال نے کوتوالوں کے روایتی سلوک کے عین مطابق شاہ حسین کو گالیاں بھی دیں اور یہ بھی کہا کہ وہ اس کی پیٹھ میں کِلّہ گاڑ کر اسے مارے گا۔ جس کے جواب میں حسین نے کہا کہ دراصل ایسا حشر خود تیرا یعنی ملک علی کا ہو گا اور اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

اکبر نے ملک علی سے کہا کہ دُلا بھٹی پھانسی پاتے وقت جو کچھ بھی کہے گا وہ حرف بحرف اسے بتا دیا جائے۔ جب بھٹی کو پھانسی کے تختے پر لے جایا گیا تو اس نے اکبر کو بے نقط گالیاں دیں جو پورے مجمعے نے بھی سنیں اور پولیس والوں نے بھی۔ ملک علی بھٹی کو پھانسی دینے کے بعد اکبر کے پاس حاضر ہوا اور بلا کم و کاست سبھی گالیاں اسے سُنا دیں۔ بادشاہ صحیح رپورٹنگ پر خوش ہونے کے بجائے اس قدر ناراض ہوا کہ اس نے ملک علی کو قتل کر دینے کا حکم دیا اور یہ بھی کہا کہ اس کی پیٹھ میں کِلّہ گاڑا جائے۔ حکم کی تکمیل ہوئی اور شاہ حسین کے سرِعام اعلان کے مطابق ہوئی جس کے سبب شاہ حسین کی عوام و خواص میں عزت و توقیر بڑھ گئی۔ دوسری طرف بھٹی اور ملک علی یعنی جلاد اور مجرم کو ایک ہی روز میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ بھٹی کی تدفین کو نسبتاً خفیہ رکھا گیا مگر علی کوتوال کی تدفین خفیہ نہ تھی اس لیے کچھ عرصہ بعد ہی اس کی قبر پر اس کی دولت سے پختہ چار دیواری اور مسجد بنائی گئی اور اس احاطہ میں علی کوتوال کے خاندان کے اور افراد بھی دفن کیے گئے۔ بھٹی باغی تھا اس

لیے اس کی قبر کا انکشاف بہت بعد میں ہوا اور یہ راز بھی اب تک بھٹی خاندان کا اندرونی راز ہی بنا رہا۔

مولوی نور احمد چشتی نے اپنی کتاب میں ملک علی اور دُولا بھٹی کا ذکر یوں کیا ہے "۔حال اس ملک علی کوتوال کا زبانی اشخاص مقبرہ سے یہ سُنا جاتا ہے کہ عہد اکبر بادشاہ میں ایک شخص عبداللہ بھٹی ساکن بار ایک ظریف مینی ٹھٹھولی اکبر کا تھا اور اس کا ایسا معمول تھا کہ بادشاہ کو سلام نہ کرتا تھا اور بادشاہ ہمیشہ ایسی تجویزیں کرتا تھا کہ وہ سلام کرے۔ حتیٰ کہ بادشاہ نے اپنے دیوان خاص میں ایک کھڑکی چھوٹی سی بنوائی اور حکم دیا کہ عبداللہ کو بلاؤ۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ جب وہ اس میں سے آئے گا تو ضرور سر نیچا کرے گا تو ہم کہیں گے کہ تو نے سجود کیا۔ جب اس کو طلب کیا تو اس نے پہلے پاؤں اندر ڈالے اور کہا کہ سلام نہ کروں گا۔ شہ نے خفا ہو کر اس کو قید مسلسل کیا اور حوالہ ملک علی کوتوال فرمایا۔ جب عبداللہ مسلسل و مقفل ہو کر مجلس میں آیا تو کوتوال نے اس کو سوال کیا کہ تو ناطرا اپنی لڑکی کا مجھ کو دے۔ تجاہل کر کے کوتوال سے کہا نزدیک آ کر مجھ کو کہہ۔ دور سے سُنائی نہیں دیتا۔ کوتوال قریب اس کے گیا اور مافی الضمیر اپنا بیان کیا تو اس نے ایک ضرب دودستہ ہتھوڑی کی جو اس کے ہاتھ میں برسم محبوساں تھی اس کے سر پہ ماری۔ وہ نادم اور خفا ہو کر بادشاہ کے پاس گیا اور عرض کیا کہ جہاں پناہ جو آدمی حیوان ہو کر انسان کو تکلیف پہنچائے اور قصد قتل کرے تو اس کی سزا کیا ہے۔ حضور نے کہا کہ قتل اس کی سزا ہے۔ ملک علی نے آتے ہی عبداللہ بھٹی کو قتل کروا دیا۔

"بعد عرصہ چند روز کے بادشاہ نے عبداللہ کو یاد کیا۔ کوتوال نے تمام حال عرض کر دیا۔ بادشاہ از بس خفا ہوئے اور کہا کہ اچھا کیا جو تم نے عبداللہ کو قتل کیا۔ اب تم تمام اپنے عیال و اطفال کو حاضر حضور کرو۔ جب وہ حاضر آئے تو بادشاہ نے حکم کیا کہ کوتوال کو مع تمام عیال و اطفال اس کے قتل کرو۔ چنانچہ حسب الحکم شاہی ملک علی کوتوال مع عیال و اطفال قتل ہوا اور جو مال منقولہ اس کا نکلا اس کے واسطے حکم دیا کہ ان کی قبور بنائی جاویں۔ سو تمام عیال و اطفال مع ملک علی یہاں دفن ہوئے اور اس کی جائیداد سے یہ قبور اور دونوں مسجدیں بنوائی گئیں۔ چنانچہ اب تک یادگار ہیں۔ پہلی مسجد کے متصل قبور زنانہ

اور دوسری مسجد کے متصل مردانہ ہیں۔

"بہرحال مرقومہ بالا نہ بانی بزرگان گورکن کے دریافت ہوا۔ اب کتاب حقیقت الفقراء سے حال اس کا یوں معلوم ہوا کہ ملک علی کوتوال شہر لاہور کا بعہد اکبر بادشاہ تھا اس وقت مقام کوتوالی مشرق رویہ حصار بلدہ دارالسلطنت لاہور مقام نخاس میں تھا۔ ان ایام میں حضرت حسین صاحب (شاہ حسین) جن کا نام مشہور مادھولال حسین ہے بحالت رندانہ صراحی مے بکف ریش و بروت تراشیدہ پھرا کرتے تھے۔ جب شہرت ان کی بدرجہ کمال ہوئی تو اکبر بادشاہ کو ان کی خبر ہوئی اس نے ملک علی کوتوال کو لکھا کہ حضرت حسین کو مقتّل کر کے حاضر کرے وہ بتعمیل حکم اکبر بادشاہ ان کی تلاش کے صدر ہوا۔ قدرت الٰہی سے تا دو ماہ وہ دستیاب نہ ہوئے۔

" اس اثنا میں عبداللہ بھٹی جو سرغنہ مفسدان و رہزنان تھا، گرفتار ہوا اور بہ نسبت اس کے حکم شاہی بنام ملک علی آیا کہ اس کو بمقام نخاس سزائے دار دے۔ اتفاقاً جس روز اس کو سُولی چڑھایا گیا تو وہاں ہجوم کثیر جمع ہوا۔ انہی میں حضرت حسین بھی میر کناں صراحیٔ مے بکف آ پہنچے۔ لوگوں نے ملک کو اطلاع دی۔ اس نے آپ کو گرفتار کیا اور زنجیر پہنائی۔ قدرت الٰہی سے زنجیر تین بار ٹوٹ گئی وہ نابکار یہ کرامت دیکھ کر معتقد نہ ہوا بلکہ بے ادبی سے کہنے لگا کہ میں آپ کے صفرہ میں میخ ٹھکوادوں گا۔ آپ نے کہا خُدا تجھ کو یہ سزا بہت جلد دے گا اور تیری مجال نہیں کہ ہم کو گرفتار کر کے روانہ کرے۔ خاطر جمع رکھ ہم خود تیرے سپاہیوں کے ساتھ دہلی جاویں گے۔ اس اثنا میں فرمان اکبری بنام ملک علی اس مضمون کا پہنچا کہ بوقت دارکشی جو کلام عبداللہ بھٹی کرے ہم کو اس سے حرف بحرف اطلاع کی جائے اتفاقاً اس بے باک نے بوقت دارکشی ہزارہا گالیاں اکبر کو دیں ملک علی نے وہ حرف بحرف درج عریضہ کر کے روانہ دہلی کیں۔ اکبر دیکھتے ہی جل گیا اور حکم دیا کہ ملک علی بڑا گستاخ ہے اس کے صفرہ میں میخ ٹھونکی جاوے۔ حتیٰ کہ تیسرے دن وہ اسی طرح مارا گیا اور حضرت حسین دہلی کو گئے۔"

(حقیقت الفقراء میں جو قصہ ہے وہ لاہور کا ہے اور اس کے مطابق بادشاہ اکبر اس زمانے میں لاہور میں موجود تھا۔۔۔ شاہ حسین کے دہلی جانے کا قصہ ممکن ہے نور احمد چشتی نے

"بہاریہ" سے لیا ہو کیونکہ ان کے پاس اس وقت "بہاریہ" کا نسخہ بھی موجود تھا اور انہوں نے دونوں کا بیان ملا کر لکھ دیا ہو)۔

ملک علی کوتوال کی قبر کے بارے میں نور احمد چشتی نے لکھا: اس ملک علی کی قبر گورستان میانی میں مع دو حجرہ مسجد موجود ہے اور حال گورستان میانی میں اس کا کمترین نے نبانی گورکنان درج کیا ہے اگرچہ انہوں نے بھی یہی بیان کیا تھا کہ دُلّا بھٹی کے باعث یہ کوتوال مارا گیا تھا مگر انہوں نے وہ بیان کسی اور طرح سے کیا تھا اس کے فرزند نے قبر اس کی بنوائی۔

نجم حسین سید نے اپنے ڈرامے "تخت لاہور" میں شاہ حسین اور دُلا بھٹی کے درمیان ایک خاص رشتہ قائم کیا ہے جس کا پس منظر یہی واقعہ ہے، انہوں نے دُلّا کو شاہی انتظامیہ کے خلاف باغی بلکہ انقلابی قرار دیا جبکہ شاہ حسین کو فکری محاذ پہ اس کا ساتھی بتایا۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان کیا رشتہ تھا یا کوئی رشتہ نہ تھا۔

حقیقت الفقراء کے مطابق شاہ حسین ابھی دس سال کے بچے تھے کہ ایک بزرگ ان کے مدرسہ میں آئے۔ یہ بزرگ شاہ بہلول دریائی تھے۔ ذات کے سپرا جاٹ تھے، چنیوٹ کے قریب گاؤں بہلول میں پیدا ہوئے۔ تذکرہ اولیائے جھنگ کے بلال زبیری کے مطابق بچپن میں ہی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ جوانی میں بلادِ اسلامیہ کے سفر پہ چل پڑے۔ عرب، عراق، ایران اور افغانستان کی سیاحت کی۔ رسول اکرمؐ، صحابہ کرامؓ، حضرت علیؓ، امام حسینؓ، امام موسیٰ رضاؓ اور حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے مزاروں پہ چلّہ کاٹا۔ افغانستان میں علاقہ پنج شیر میں ایک بزرگ کے پاس بھیجے گئے جہاں سے وہ حسین کے پاس لاہور آئے۔ اس وقت حسین کی عمر صرف دس سال تھی، توجہ کی، پھر تربیت کی اور حسین کو داتا گنج بخش کے مزار پہ مزید عبادت کی ہدایت کر کے واپس اپنے علاقے کو چلے گئے۔ مگر اپنے گاؤں میں جانے کی بجائے اکبر کے باغی دُلّا بھٹی کے گاؤں پنڈی بھٹیاں سے ملحق گاؤں قلعہ کنگراں میں رہنے لگے۔ یہاں بھی ان سے متعدد کرامات منسوب ہیں۔

شاہ بہلول بلاشبہ حسین کے استاد تھے ان کی تربیت انہوں نے کی اور ان کے بعد شیخ سعداللہ نخاس میں ہی بہت بڑے مدرسے (اس عہد کی یونیورسٹی) کے استاد تھے۔ حسین کی تعلیم کی، حسین انہی کے درس سے اُٹھ کر قلندری کی راہ پر چل پڑے تھے۔ شیخ سعداللہ ملامتی مسلک کے قائل تھے اور اکبر بادشاہ اگرچہ انہیں ملنے کے لیے بُلاتا تھا اور بہت عزت کرتا تھا مگر اس کے دل میں کچھ شکوک بھی تھے۔

یوں شاہ بہلول اور دُلا بھٹی میں علاقائی رفاقت کے علاوہ فکری ہم رنگی کے امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح ان چاروں یعنی شاہ بہلول، دُلا بھٹی، شاہ حسین اور شیخ سعداللہ میں بھی ربط وضبط نظر آتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ رابطہ نہ ہوتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ شاہ حسین دُلا بھٹی کو پھانسی لگنے کے دن مجمعے میں آجاتے۔ ان کی زندگی میں اس قسم کے مجمعوں میں آنے جانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ویسے بھی اتنی کومل فکر رکھنے والا شاعر "مجرموں کی سرعام پھانسی" کے واقعے کو کوئی اہمیت نہیں دے سکتا مگر اپنے آدرش کی خاطر پھانسی پر جھول جانے والوں کے لیئے شاہ حسین کے دل میں احترام کا بے پناہ جذبہ موجود ہے۔ منصور کے بارے میں کہتے ہیں۔

عشقے دے دریاؤ کراہیں، منصور قبولی سُولی

(عشق کے دریا کی راہ گزر ہی اُلٹی ہوتی ہے، اس عشق میں منصور نے سُولی بھی قبول کر لی)۔

کہے حسین سہاگن سائی جو گل کٹیں واندی نچی

(حسین سہاگن وہی ہے جو گلا کٹا کر بھی ناچتی رہتی ہے)۔

یا دلبر یا سر کر پیارا

دے دے لعل لباں دے لارے سُولی اپر چڑھ لے ہلارے

(یا دوست کو عزیز جان یا اپنے سر کو پیارا رکھ، ہونٹوں کے لعلوں کی چاہت میں سُولی کے جھولے کے مزے لے)۔

بقولِ فیضؔ

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے　　تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

اور

توڑے سر وبنجے دھڑ ناوں　　تاں بھی حال نہ کہیئے دو
دبے تنک سر دھڑ سے الگ ہو جائے ہم رازِ درون پردہ آشکار نہیں کریں گے)۔
اس طرح لگتا ہے کہ شاہ حسین کا دُلّا بھٹی سے ایک اندرونی ربط تھا اور وہ یہ دیکھنے آئے تھے کہ ان کا دوست ممدوح یا مدّاح کس درجے سے مقتل کو جاتا ہے اور اس کی کون سی شان سلامت رہے گی۔

مخدوم الملک مُلا عبداللہ سلطانپوری

محمد بیر اور داراشکوہ نے شاہ حسین اور اکبر کے مخدوم الملک مُلا عبداللہ سلطان پوری کے درمیان مکالمہ کے دو الگ الگ واقعات لکھے ہیں۔ محمد بیر نے یوں لکھا ہے کہ "اکبر کے عہد میں مخدوم الملک ایک بے مثال عالم تھا۔ علوم معقولات کا عالم اور فنونِ معقولات کا ماہر، صرف و نحو اس کے سامنے بچوں کا کھیل تھے۔ معانی و منطق میں دانا، ریاضی، ہیئت اور حکمت میں پیدائشی تاک، فقہ، تفسیر، حدیث کے علوم میں یکتا، صغریٰ و کبریٰ اور دلیل و بُرہان کے معاملات چٹکی میں بتانے اور طے کرنے والا اور اپنے اسی علم کے زور پہ اکبر نے اسے ہندوستان کا مخدوم الملک بنا رکھا تھا۔۔۔۔ مخدوم الملک کہیں پر بھی شرع کی خلاف ورزی برداشت نہ کرتا اور اس بارے میں اتنا سخت تھا کہ موقع پر پہنچ کر سزا دینے میں تامّل نہ کرتا، اسی طرح شراب کے استعمال کے بھی سخت خلاف تھا اور بعض اوقات شراب سازوں کے ٹھکانوں پر پہنچ کر انہیں سزا دیتا اور شراب نالیوں میں بہا دیتا۔۔۔۔ چنانچہ اس کے وجہ سے غیر شرعی حرکتیں کرنے والوں کو مستقل خوف رہتا تھا"۔

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کو، جو ان دنوں لاہور میں تھا، اطلاع ملی کہ ایک شخص شیخ حسین جو بہت پڑھا لکھا ہے اور زہد و ریاضت کے دور سے بھی گزر چکا ہے اب فقیر بن کر شراب

پیتا ہے، اس نے داڑھی اور مونچھیں منڈا دی ہیں۔ لال کپڑے پہن لیے ہیں۔ اپنے طائفہ کے ساتھ شراب پی کر بیانگ دہلی شہر میں ناچتا گاتا پھرتا ہے اور اس انداز میں شریعت کی سرِعام توہین کرتا ہے۔

مخدوم الملک یہ سن کر سخت ناراض ہوا اور اپنے کارندوں سے کہا کہ حسین کو اسی حالت میں اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ حسین کو پکڑ لیا گیا اور مخدوم الملک کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ مخدوم الملک نے حسین کی ہیئت کذائی دیکھی تو سخت غصے میں اس سے پوچھنے لگا کہ اس بادہ و صراحی و جام کی کس مذہب نے اجازت دے رکھی ہے؟ مشائخ نے اس قسم کے رقص و سرود و سماع کو کہاں، کب اور کس کے لیے روا رکھا ہے؟ تو نے جو داڑھی منڈوا رکھی ہے، کیا شریعت میں یہ نامناسب کام ہے یا نیکوکاری ہے؟

حسین کو مخدوم الملک کے اندازِ تخاطب پر سخت اعتراض تھا اس لیے انہوں نے پہلا سوال تو یہی کیا کہ مخدوم الملک ہی بتائے کہ اس طرح سوال کرنے کا حق اسے کون سے مذہب نے دے رکھا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ عالم فاضل ہونے کے باوجود اسے اصل حقیقت جاننے کی اپنے طور پر سعی کرنی چاہیئے تھی جو نہیں کی گئی۔

حسین نے کہا کہ میں جو کچھ ظاہر میں کر رہا ہوں یہ سرور کائنات ؐ کی شریعت کے خلاف ہے مگر تم میرے اندر جھانک کر دیکھو تو میں اپنے ایمان کے لحاظ سے شریعت کا غلام ہوں اس لیے کہ خدا اور پیغمبر کی شرع خود فقر ہے اور رسول اکرم ؐ کی سنت بھی فقر ہے۔ فقر کا مذہب ترکِ دنیا ہے اور خدا نے اپنے فضل سے مجھے بھی ترکِ دنیا میں کامیاب بنایا ہے۔ لباسِ شریعت تو میرے اندر ہے اور میرا دل فدائے رسول ؐ ہے کیونکہ ترک دنیا ہی عبادت کا راز ہے اور پیغمبر ؐ کی بھی حدیث یہی ہے جو میں ظاہر میں ہوں وہ نہیں ہوں جو اندر سے ہوں جو اصل میں شرعِ رسول ؐ ہے وہی تو فقر کے نام پر میں نے قبول کر رکھا ہے اس لیے پیغمبر ؐ کی شریعت کی رو سے میرا باطن میرے ظاہر کے مقابلے میں بہتر صورت رکھتا ہے۔ اگر ظاہر اور باطن کے اس بُعد پہ تجھے

مزید دلائل و برہان کی ضرورت ہے تو میں وہ بھی پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن میں اپنے باطن کی صرف ایک کیفیت اس صراحی کے ذریعے دکھانا چاہتا ہوں۔

تم سمجھتے ہو کہ اس صراحی میں شراب ہے، ٹھیک ہے اس میں شراب ہی ہے مگر اسی صراحی میں سے میں سات جام پُر کروں گا۔ تم یہ سات کے سات جام چکھ لو اور پھر بتاؤ کہ یہ کیسی شراب ہے، پھر اس پر شریعت کے اصول نافذ کرو، پھر میرے باطن اور ظاہر کے بارے میں فیصلہ کرو۔ حسین نے جام پُر کئے۔ مخدوم الملک نے ان کو چکھ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ ایک ہی صراحی سے ایک ہی وقت میں خالص پانی، شکر کا شربت، دودھ، سرکہ، قہوہ، چائے اور عرق گلاب کے جام بھرے گئے۔

مخدوم الملک شاہ حسین کی اس عملی دلیل سے سخت حیران ہوا اسے تسلیم کرنا پڑا کہ حسین کا ظاہر اور باطن کا سوال کسی ایسی سطح پر اٹھا ہے جہاں خود مخدوم الملک کی پہنچ نہیں ہے وہ اس راز کو اپنے سارے علم کے باوجود سمجھ نہیں سکتا۔ اس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے تسلیم کیا کہ واقعی سات قسم کے مشروب اسی صراحی میں سے نکلے ہیں جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس میں شراب ہوتی ہے اور حسین یہی شراب پی کر شہر میں مست الست پھرتے ہیں۔ شاہ حسین نے کہا:

هست در پیش وحدتِ بے شک — بادۂ ایں تمام اشرب یک
ہست ہستی موحّد از توحید — رَستہ از دوئی و از تقلید
بر تو آمد مباح در رہ دیں — ہر چہ خواہی بکن چہ آں و چہ ایں

(ان تمام مشروبات کی اصل ایک ہے، یہی توحید ہے، موحّد کے واسطے، وہ دوئی اور تقلید کو نہیں مانتا ہے، اب اس کے بعد دینی اعتبار سے جو مباح ہے اس کا فیصلہ تو کر۔ اور میرے ساتھ تو جو چاہتا ہے کرے)

شاہ حسین یہ کہہ کر مخدوم الملک کی عدالت سے نکل گئے، مخدوم الملک نے حیرت کے عالم میں کہا کہ حسین نیک و بد کو جان گیا ہے، وہ جو کچھ کرتا ہے شرع میں روا ہے، وہ خدا کا فقیر ہے۔ اس

نے تقلید سے کنارہ کشی کی اور راہِ توحید پہ گامزن ہو گیا اگرچہ ظاہر میں زندیق نظر آتا ہے مگر برحق مومن ہے اس کے ظاہر پہ جانے کی ضرورت نہیں اس کے اندر کو دیکھنا چاہیئے کیونکہ :

راست مردِ خدا است شاہ حسین

دارا شکوہ حسنات العارفین میں لکھتا ہے: اس نے (شاہ حسین) نے طریقِ ملامت کو دہل اور نقارے کی چوٹ ظاہر کیا اور متاخرین میں اس کی طرح کسی نے طریقِ ملامت (شریعت) پامال نہیں کیا۔ اہلِ ملامت کا استاد تھا اور ایسا تھا جیسے مخدوم الملک کو شبلِ خلیل کے غلام کے ایک مرد برائی تھا چاہا کہ اس (شاہ حسین) کو سزا دے۔ لاہور کے بازار میں اس کو ساز و نوا کے ساتھ دیکھا اور شیخ (حسین) نے اس (مُلّا عبداللہ سلطان پوری) کے گھوڑے کی باگ پر ہاتھ ڈالا اور کہا کہ " اے، سوال سُن اور جواب دے۔۔۔۔ اسلام کے ارکان پانچ ہیں۔ توحید میں میں اور تو شریک ہیں۔ حج اور زکوٰۃ کو تو نے چھوڑ رکھا ہے۔ نماز روزہ میں نے چھوڑ رکھا ہے۔ میں کس واسطے مستحق سزا ہوں اور تو نہیں ہے "

وہ (سلطان پوری) جواب دینے میں خاموش رہا اور پھر سزا کا ارادہ نہ کیا "

ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے " کلام شاہ حسین " کے دیباچہ میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ واقعہ جو مفتاح العارفین (۱۰۸۵ھ) میں معصوم سرہندی نے بیان کیا ہے معلوم نہیں کب پیش آیا۔ مخدوم الملک کے معزول ہونے (۹۷۵ھ) سے پہلے یا بعد۔۔۔۔ اگر پہلے پیش آیا تو حسین جرأت کے سب سے ممتاز تمغے کا مستحق ہے اور اگر بعد تو پھر یہی کہا جائے گا کہ مرے کو مارے شاہ حسینؒ "۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ واقعہ مفتاح العارفین کے حوالے سے معصوم سرہندی کے کھاتے میں ڈال دیا مگر مفتاح العارفین کی بجائے اس سے پہلے تصنیف کی جانے والی کتاب حسنات العارفین میں اس کا ذکر ہے اور اگرچہ دارا شکوہ نے راوی کا ذکر نہیں کیا مگر ہو سکتا ہے کہ طبیب سرہندی نے یہ بیان کیا ہو۔۔۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے ڈاکٹر نذیر صاحب نے کم از کم زمانی اعتبار سے

اس واقعہ کا تعین نہیں کیا حالانکہ یہ بہت آسان کام تھا۔ شاہ حسین چھتیس برس کی عمر میں ۹۸۱ھ میں مدرسہ و خانقاہ سے نکل کر کوچہ و بازار اور دشت و صحرا میں آ گئے تھے اور ان کی کڑی گرفت اسی زمانے میں ہوئی ہے۔ شاہ حسین کا یوں روپ بدل لاہور شہر کا کوئی ایسا معمولی واقعہ نظر نہیں آتا۔ دارا شکوہ کے اندازِ تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسین نے ایک ایسی ہلچل ڈال دی تھی کہ نہ اس کی نظیر پہلے ملتی ہے اور نہ ان کے بعد۔ ۔ ۔ ۔ اس لیے چھوٹی سی مسجد کے امام سے لے کر چار بادشاہوں کے شیخ الاسلام رہنے والے مولانا عبداللہ سلطانپوری تک سبھی کو اس روایت شکن حسین پر بجا طور پہ بے تحاشا غصہ آیا ہوگا۔ حسین جیسے پڑھے لکھے آدمی کو روکنا، ٹوکنا عام مولوی کے بس کی بات یقیناً نہیں تھی کیونکہ انہوں نے تو شہر کے سب سے بڑے استاد شیخ سعداللہ سے علم اور ملامت دونوں چیزیں حاصل کی تھیں اس لیے عبداللہ سلطان پوری ہی کے نصیب میں یہ لکھا ہوا تھا کہ وہ سر بازار حسین کے سوال کے سامنے لاجواب ہو جائے اور یہ واقعہ یقیناً ۹۸۱ یا ۹۸۲ھ میں پیش آیا ہوگا جب سلطانپوری کے عروج کا زمانہ تھا۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے حاشیہ میں لکھا ہے: مخدوم الملک کا زوال اکبر کی اس حکمت عملی سے ہوا کہ اس نے ایک محضر کے ذریعے، جسے شیخ مبارک نے ڈرافٹ کیا۔ ۱۵۷۹ء (۹۸۷ھ) میں اپنے سلطان عادل ہونے کا اعلان کرا دیا۔ اسلامی شرع میں چونکہ سلطان العادل کا درجہ مجتہد سے بھی اونچا ہوتا ہے اس لیے اکبر کو یقین تھا کہ اب مختلف فیہ مسائل میں میرا اپنا فیصلہ ہی ناطق ہوگا۔ اور میں مخدوم الملک اور صدر الصدور کی ہر ایسی تجویز کو جو میری پالیسیوں میں حائل ہوگی ویٹو کر سکوں گا۔ اس محضر پہ شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں یعنی ابوالفضل اور فیضی نے تو خیر دستخط کرنے ہی تھے کہ یہ ساری چال (یعنی کہ اکبر کو باوجود ان پڑھ ہونے کے اعلم، اعقل اور عادل قرار دیا جائے)، انہیں کی اختراع تھی لیکن مخدوم الملک (عبداللہ سلطان پوری) صدر الصدور شیخ عبدالنبی قاضی القضاۃ جلال الدین ملتانی اور مفتی کل صدر جہاں کو بھی اس پر مجبوراً دستخط کرنے پڑے۔ ۔ ۔ ۔ آخر کار اس "سلطان العادل نے مخدوم الملک اور صدر الصدور

کو معزول کیا اور کچھ وقت گزرنے پر ۹۸۰ھ (۱۵۸۰ء) میں انہیں مکے بھجوا دیا کہ اللہ اللہ کریں"۔

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ مخدوم الملک نے اس محضر پہ مجبوراً دستخط کیے تھے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب شاہ حسین کوئے ملامت کی طرف آئے تھے اور مخدوم الملک نے ان سے بھی وہی کچھ کرنا چاہا ہوگا جو شیخ علائی اور عبداللہ نیازی سے کیا گیا تھا تو حسین نے ایک ہی سوال پہ انہیں اس لیے مات کیا ہوگا کہ اس وقت تک مولانا عبداللہ سلطان پوری اپنے گھر کے اندر مفروضہ عزیزوں کی قبروں میں منوں سونا دفن کر چکے ہوں گے۔ اب ان میں وہ بات نہ رہی ہوگی جس کے تحت انہوں نے شیر گڑھ سے سید داؤد کرمانی کو گوالیار میں، سلیم شاہ سوری کے دربار میں طلب کیا تھا اور دارا شکوہ صحیح کہتا ہے کہ "وہ (عبداللہ سلطان پوری) جواب دینے میں خاموش رہا اور پھر سزا کا ارادہ نہ کیا"۔

مولانا عبداللہ سلطان پوری اور شاہ حسین کے درمیان ہونے والے مکالمے کے حوالے سے ڈاکٹر نذیر لکھتے ہیں "اگر یہ واقعہ ان (سلطان پوری) کے معزول ہونے سے پہلے پیش آیا تو حسین جرأت کے سب سے بڑے تمغے کا مستحق ہے"۔

مولانا عبداللہ سلطانپوری کے بارے میں تاریخ میں بہت کچھ موجود ہے کیونکہ وہ چار بادشاہوں کے شیخ الاسلام یا مخدوم الملک رہے اور یہ پچاس سال سے زائد کا عرصہ ہے جب حسین نے جنم لیا تھا اس وقت بھی سلطان پوری بادشاہ کے شیخ الاسلام تھے جب حسین نے "سر بازار مے رقصم" کی دھن آغاز کی، سلطان پوری اس وقت بھی کر رہے ہیں بہت اہل چشم بر سر دربار"

مولانا ابوالکلام آزاد نے "تذکرہ" میں بہت خوب صورتی سے مولانا عبداللہ سلطان پوری کی نقاب کشائی کی ہے۔ شیخ مبارک، ابوالفضل اور فیضی نے مولانا کے تمام تر "احسانات" کا کمال خوبی سے ذکر کیا ہے۔ سید محمد جونپوری مہدوی کے ماننے والے شیخ علائی اور عبداللہ نیازی کے ساتھ سرِ دربار جو جو سلوک ہوا اس کا بیان بھی بہت ہے۔ زیادہ تفصیل سے تو نہیں مگر شاہ حسین کی اس جرأت کا کہ انہوں نے سلطان پوری کے گھوڑے کی لگام کو پکڑ لیا اور پھر

سلطان پوری سے سزا کا مطالبہ کیا، اندازہ لگانے کے لیے کچھ نہ کچھ بیان محمد اسحق بھٹی کی زبانی:

"شیخ عبداللہ بن شمس الدین انصاری سلطان پوری عالم کبیر اور شیخ عصر تھے۔ اصلاً علاقہ سندھ کے شہر ٹھٹھہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا ٹھٹھہ سے مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر چلے گئے تھے۔ شیخ عبداللہ اسی علاقے کے ایک مقام سلطان پور میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ سرہند میں تعلیم مکمل کی۔ وسعتِ علم اور عمل و تقویٰ میں خاص شہرت کے حامل تھے۔۔۔ مغل حکمران نصیر الدین ہمایوں ان سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا اس نے ان کو شیخ الاسلام کا منصب عطا کیا تھا۔۔۔ شیخ عبداللہ سلطان پوری نے ہندوستان کے چار بادشاہوں، ہمایوں، شیر شاہ سوریؔ سلیم شاہ سوری اور جلال الدین اکبر کا زمانہ پایا۔

"ہمایوں نے اپنے پہلے دورِ حکومت میں بھی ان کو پورے ملک کا شیخ الاسلام مقرر کیا اور پھر جب وہ ایران سے واپس آ کر دوبارہ سریر آرائے سلطنت ہوا تو بھی اس نے ان کو اس منصب جلیلہ پر فائز رکھا۔ شیر شاہ سوری نے ان کو صدر الاسلام کے لقب سے ملقب کیا۔ اس کا بیٹا سلیم شاہ سوری تو ان کا اس قدر معتقد تھا کہ ان کو اپنے برابر تخت پر بٹھاتا اور بیش بہا نذرانے پیش کرتا تھا۔

"ہمایوں کے بعد جلال الدین اکبر نے ان کو مخدوم الملک کے خطاب سے نوازا اور ایک لاکھ درہم ان کا وظیفہ مقرر کیا۔۔۔ وہ علامۂ زمان اور یگانۂ دوراں تھے، حدیث، فقہ اصول اور باقی علوم عربیہ اور تاریخ میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ تمام مروجہ نقلی اور عقلی علوم میں ماہر کامل تھے۔۔۔ ان کا تصنیفی ذوق بھی بلند تھا اور وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن میں کشف الغمۃ، عصمۃ الانبیاء، شرح شمائل النبیؐ شرح عقیدۂ حافظیہ اور بہت سے رسائل شامل ہیں۔

"ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے۔ شیخ متعصب سُنّی تھے اور شیعہ کے شدید مخالف، صمصام الدولہ شاہ نواز خان نے مآثر الامراء میں لکھا ہے۔۔۔ جب شیر شاہ سوری بادشاہ ہوا تو اس نے اس کو صدر الاسلام کا خطاب دیا۔ کہتے ہیں ایک دن سلیم شاہ سوری نے ملا عبداللہ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا تھا۔۔۔ "بابر بادشاہ کے چار بیٹے تھے، چار چلے گئے ایک باقی رہ گیا ہے۔"

سرمست خان نے کہا: ایسے فتنہ پرداز کو زندہ کیوں چھوڑ رکھا ہے؟ جواب دیا۔ اس سے بہتر آدمی نہیں ملتا جب مُلّا قریب آیا تو سلیم شاہ نے اسے تخت پر بٹھایا۔۔۔ مروارید کی تسبیح اس کو پیش کی جس کی قیمت بیس ہزار روپے تھی۔

"مُلّا عبداللہ انتہائی متعصب شخص تھا اس تعصب کو وہ دینداری سے تعبیر کرتا تھا اور اس کے پردے میں مخالفوں کے خلاف غیظ و غضب کے اظہار کا اس کو خوب موقع ملتا تھا۔ شیخ علائی کا قتل بھی اس کے اسی تعصب اور مخالفت کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔"

"شیخ علائی، شیخ حسن کے لائق فرزند تھے، جن کا شمار بنگال کے کبار شیخ میں ہوتا تھا بیت اللہ سے واپس آنے کے بعد بیانہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں ایک اور بزرگ شیخ عبداللہ نیازی نے بھی بیانہ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ شیخ عبداللہ نیازی، شیخ سلیم چشتی (اکبر کے مرشد) کے خلفاء میں سے تھے اور سفرِ حجاز سے واپس آنے کے بعد میر سید محمد جونپوری سے وابستہ ہو گئے تھے۔ شیخ علائی کو عبداللہ نیازی کا اسلوب حیات پسند آیا۔ وہ متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اس ضمن میں یہاں تک آگے بڑھ گئے تھے کہ شب کو صبح کے لیے کوئی چیز گھر میں باقی نہیں رہنے دیتے تھے سب کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے۔ پانی کے مٹکے بھی خالی کر دیتے کہ کل اللہ تعالےٰ کوئی اور ذریعہ پیدا فرمائے گا۔

مُلّا عبداللہ سلطان پوری نے شیخ علائی پر بدعت و خروج کا الزام عائد کیا اور سلیم شاہ سوری کو جو اس وقت ہندوستان کا بادشاہ تھا اس بات پر آمادہ کیا کہ شیخ علائی کو بیانہ سے طلب کیا جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے خیالات کے بارے میں علماء سے مذاکرہ کرے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد "تذکرہ" میں لکھتے ہیں "مخدوم الملک نے سلیم شاہ سے فرمان جاری کرکے شیخ علائی کو آگرہ میں طلب کرایا اور اکثر مشاہیر علماء عہد مثلاً سید رفیع الدین محدث اور شیخ ابوالفتح تھانیسری بھی بحث مباحثہ کے لیے طلب کیے گئے۔ شیخ علائی اپنے ساتھیوں کے ساتھ دربار میں پہنچے تو پھٹے پرانے کپڑوں اور فقیرانہ و نامردانہ وضع و صورت میں درویشوں کی ایک شکستہ حال

جماعت تھی لیکن کبر وعلو حق کا یہ حال تھا کہ صرف سلام مسنون کر کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے اور تمام دربار پر اس حقارت و بے پروائی سے نظر ڈالی گویا مزدور انسانوں کی جگہ پتھروں کا ڈھیر ہے۔ یہ خودداری سلیم شاہ پر بہت گراں گزری۔ بحث شروع ہوئی تو شیخ علائی نے قرآن وحکیم کی چند آیات تلاوت کیں، اور ان کی تفسیر کا وعظ شروع کیا۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ وعظ کا مضمون زیادہ تر مذمت دنیا و حالات آخرہ و اہانتِ علمائے دنیا اور فرائض امراء و سلاطین پر مشتمل تھا اور کچھ ایسا پُر تاثیر و درد انگیز طرز بیان تھا کہ ادھر شیخ کی زبان سے الفاظ نکل رہے تھے ادھر تمام مجمع کی سنگدلی موم کی طرح پگھل رہی تھی خود سلیم شاہ سوری اور اس کے امراء کا یہ حال ہوا کہ باوجود کمال شقی القلبی اور حق فراموشی کے ضبط نہ کر سکے۔ اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"یہ حال دیکھ کر سلیم شاہ کا خیال پلٹ گیا اور بے اختیار ہو کر شیخ کی نہایت تعظیم وتکریم بجالایا۔ پوچھا کہ باوجود ان کمالات وفضائل کے کیا سبب ہے کہ لوگ تمہارے مخالف ہیں بھلا شیخ علائی اس کا کیا جواب دیتے۔

دل را کہ تو مقید زنداں حسرت است
بر جرمِ عشق ہیچ گناہے دگر نہ بود

حکم دیا کہ شیخ کے لیے طعام خاصہ سے کھانا بھیجا جائے لیکن شیخ نے نہیں کھایا اور کہا "تمہارا کھانا تو مسلمانوں کا حق ہے اور تم خلاف شرع اس حق کو مار رہے ہو۔"

دوسرے دن مباحثہ ہوا، تمام علماءِ دربار کی طرف اور یہ درویش بے نوا ایک طرف لیکن جو شخص زبان کھولتا تھا چند منٹوں میں ذلیل و رسوا ہو کر لاجواب ہو جاتا تھا۔ مخدوم الملک کو تو بات تک کرنے نہ دی۔ بار بار اس کو مخاطب کر کے کہا "تم دنیا دار ہو، دین کے چور ہو اور غیر شرعی حرکات کے مرتکب ہوئے ہو۔"

مباحثہ کا رنگ دیکھ کر سلیم شاہ کو یقین ہو گیا کہ تمام علماء بلا وجہ ایک حق پرست درویش کے پیچھے پڑ گئے ہیں تاہم مجبور تھا۔ رعایا انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی اور معاملہ مذہبی تھا جس میں خود

دخل دے نہیں سکتا تھا۔ ۔ ۔ ہر روز شیخ علائی کا معاملہ پیش ہوتا اور یہ ٹال جاتا۔ بدایونی لکھتے ہیں "مخدوم الملک" ساعت بساعت سلیم شاہ تحریص بر قتل اُو مے نمود"۔ ساتھ ہی روزیہ خبریں اُڑنے لگیں کہ آج فلاں سردار شیخ کا مرید ہوا اور کل فلاں امیر نے ان کا وعظ سُن کر گھربار لٹا دیا۔ آخرالامر سلیم شاہ نے صرف حکم جلاوطنی پر کفایت کی اور شیخ کو دکن چلے جانے کا حکم دیا۔ شیخ نے دکن کی راہ لی۔ لیکن صرف اتنی ساری سزا سے علماءِ دنیا کی خون آشام پیاس کب بجھنے والی تھی۔ چند دن کے بعد موقع پاکر پھر سلیم شاہ کو ابھارا۔ اور طرح طرح کے اشتعال انگیز قصّے سُنا کر شیخ علائی کے قتل پر آمادہ کرنا چاہا۔ ۔ ۔ ۔ بڑا جرم شیخ علائی کا یہ تھا کہ جہاں جاتا ہے ایک دُنیا اُس کے ساتھ ہو جاتی ہے، دکن کی طرف جلاوطن کر کے بھیجا تو وہاں بھی بہار خان حاکم ہنڈیا اور اطراف دکن کے ہزارہا آدمی معتقد مرید ہو گئے۔ شیخ پر موقوف نہیں ہمیشہ داعیانِ حق کا سب سے بڑا جرم شاہانِ ظلم وجور اور علمائے دجل وفساد کی نظروں میں یہی رہا ہے کہ دنیا ان کی طرف کیوں کھنچتی ہے۔

"بالآخر شیخ علائی کو دوبارہ آگرہ طلب کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے سلیم شاہ نے علمائے دارالحکومت خصوصاً مخدوم الملک کی خود غرضیوں اور حسد وفساد کو اس بارے میں محسوس کر لیا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ ان لوگوں کی رائے بے لاگ نہیں ہے اسی لیے اس مرتبہ شیخ کو شیخ بڈھا بہاری کے پاس بھجوا دیا کہ مشاہیر علماء وقت میں سے تھے اور لکھا کہ جو فیصلہ آپ کا ہو اسی پر عمل کیا جائے۔ بدایونی لکھتے ہیں، پہلے تو شیخ بڈھا نے ایک حق پرستانہ تحریر لکھی ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن افسوس کہ بعد کو دنیا پرستی مانع آگئی۔ ان کے لڑکوں نے سمجھایا کہ آج کل مخدوم الملک کی شیخ الاسلامی ہے اس کے خلاف رائے دینا ٹھیک نہیں اگر اس نے سلیم شاہ کو کہہ کر تم کو اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے آگرہ طلب کرایا تو اس بڑھاپے میں بیکار سفر کی زحمت اٹھاؤ گے۔ یہ بات شیخ بڈھا کے دل پر اثر کر گئی اور پہلی تحریر چاک کر کے دوسرا مراسلہ اس مضمون کا بھیج دیا۔ "مخدوم الملک امروز از علمائے محققین است۔ سخن سخن از و فتویٰ فتویٰ او ست"۔ یعنی آج مخدوم الملک ہی عالم اور محقق

ہیں اور انہی کا کہا حرفِ آخر ہے اور انہی کا فتویٰ ہی فتویٰ ہے۔"

"جب شیخ بڈھا نے بھی مخدوم الملک کی تائید کی تو (سلیم شاہ) بالکل مجبور ہو گیا اور شیخ کا معاملہ مخدوم الملک کے حوالے کر دیا۔ شیخ علائی اس وقت سخت بیمار تھے۔ گلے میں ایک بڑا زخم تھا۔ اور بہار تک سفر کرنے کی زحمت نے نیم جان کر دیا تھا۔ مخدوم الملک نے حکم دیا کہ کوڑے لگائے جائیں۔ جلاد نے تیسری ہی ضرب لگائی تھی کہ اس شہیدِ حق کی روح پرواز کر گئی۔

"افسوس مرنے کے بعد بھی ظالموں کی تسکین نہ ہوئی اور اس فنافی الحق کی نعش کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو بدر و اُحد کے مقتول کفار کے ساتھ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر نعش کو چروایا گیا اور اس کے ٹکڑوں کی تمام لشکر میں تشہیر کی گئی پھر حکم دیا کہ دفن نہ کیا جائے اور اس غرض سے پہرہ بٹھا دیا گیا۔"

"یہ سرگذشت تو شیخ علائیؒ کی ہے ان کے پیر حضرت شیخ عبداللہ نیازی کا واقعہ بھی اس سے کم درد انگیز اور عبرت ماجرا نہیں۔ بدایونی لکھتے ہیں جب شیخ علائی دکن کی جانب جلاوطن کر دیئے گئے تو اس کے کچھ عرصہ بعد سلیم شاہ سرحدی افغانوں کی شورش کا حال سُن کر پنجاب کی جانب روانہ ہوا۔ جب بیانہ کے قریب شاہی لشکر پہنچا تو مخدوم الملک نے کہ پیوستہ کمربستہ خاصانِ حق کی ذلت و ہلاکت کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے تھے موقع کو غنیمت سمجھا اور سلیم شاہ سے کہا کہ چھوٹے فتنہ شیخ علائی سے تو کچھ خلاصی ہو گئی ابھی بڑا فتنہ برپا ہے۔" سلیم شاہ نے پوچھا وہ کون؟ کہا! شیخ عبداللہ نیازی کہ یہیں بیانہ میں مقیم ہے اور شیخ علائی کا پیر ہے۔ سلیم شاہ نے میاں بہوہ لوہانی حاکم بیانہ کو حکم بھیجا کہ فوراً شیخ کو حاضر لشکر کرو۔ میاں بہوہ شیخ کا مرید تھا اس نے شیخ کو بہت سمجھایا کہ آپ یہاں سے راتوں رات نکل جائیں..... میں کوئی بہانہ کر دوں گا لیکن شیخ نے کہا "یہاں وہاں خدا کا ارادہ مساوی ہے جو مقدر ہو گا وہی ہو گا۔ مجبوراً شیخ کو ہمراہ لیا۔ شیخ لشکر شاہی میں پہنچے تو بے باکانہ گردن اٹھائے جا کھڑے ہوئے اور السلام علیک کہا۔ میاں بہوہ نے کہ کسی نہ کسی طرح سلیم شاہ کے غیظ و غضب سے ان کو بچانا چاہتا تھا گردن پکڑ کے

جھکا دی اور کہا "بادشاہ کو یوں نہیں، یوں سلام کرتے ہیں۔" اس پہ شیخ نے گرج کر کہا "جو سلام کہ سُنت ہے اور صحابہ اللہ کے رسول کے سامنے کیا کرتے تھے یہی ہے۔ اس کے سوا میں اور کوئی سلام نہیں جانتا۔ سلیم شاہ نے غضب ناک ہو کر اشارہ کیا اور لشکریوں نے لاٹھیوں کوڑوں مکوں اور لاتوں سے پیٹنا شروع کر دیا جب تک ہوش رہا آیت قرآنی وردِ زبان تھی ... سلیم شاہ نے پوچھا کیا کہتا ہے۔ مخدوم الملک نے کہا "آپ کو اور ہمیں کافر کہتا ہے۔" اس پر اس کو اور زیادہ طیش آیا اور جب تک موت کا یقین نہیں ہو گیا برابر زدوکوب کا حکم دیتا رہا.......

سلیم شاہ کی حکومت دو برس بعد ختم ہو گئی۔ ہمایوں پھر بادشاہ ہند ہوا اور مُلّا عبداللہ سلطان پوری کو شیخ الاسلام ہی بنائے رکھا۔ جب اکبر سریر آرائے سلطنت ہند ہوا تو مُلّا عبداللہ کو مخدوم الملک کا خطاب ملا۔ بیرم خان نے ایک لاکھ روپے کی آمدنی والا پرگنہ "مانک والا" اس کو دے کر اس کا مرتبہ تمام امرا و اکابر سے بڑھا دیا۔ اکبر کے عہد میں چھبیس برس (۹۸۷ھ) تک مُلّا کو یہی مرتبہ اور مقام حاصل رہا۔ اسی اثنا میں مُلّا عبدالقادر بدایونی نے لکھا "مخدوم الملک کی دولت اور تموّل کا یہ حال تھا کہ صرف گھر کے صندوقوں میں ہی نہیں بلکہ خاندانی قبروں میں بھی چاندی سونے کی اینٹیں ہی مدفون تھیں۔ بااین ہمہ دولت و تموّل عمر بھر کبھی زکوٰۃ ادا نہ کی۔ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یہ حیلہ گھڑ لیا تھا کہ ہر سال کے آخر میں اپنا تمام خزانہ بیوی کے نام ہبہ کر دیتے اور وہ ایک سال پورا ہونے سے پہلے ان کے نام بخش دیتی ---- اس طرح دونوں پہ زکوٰۃ کی ادائیگی ختم ہو جاتی۔

محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں "منقول ہے کہ اس نے (عبداللہ سلطان پوری) فتویٰ دیا تھا کہ اس دور میں حج کی فرضیت ساقط ہو چکی ہے بلکہ حج پر جانا معصیت کی ذیل میں آتا ہے۔ جب لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے دلیل دی کہ حج کے لیے اگر خشکی کے راستے جائیں تو گجرات اور عراق (ایران؟) کا راستہ ہے جو شیعوں اور قزلباشوں کی لوٹ مار کی وجہ سے

پُرخطر ہے اور اگر سمندر کے راستے جائیں تو فرنگیوں سے پروانہ راہ داری لینے کی ذلت برداشت کرنا پڑتی ہے جس پر حضرت عیسےٰؑ اور حضرت مریمؑ کی تصویریں چھپا ہوتی ہیں اور یہ بُت پرستی کی ایک شکل ہے اس لئے شرعی اعتبار سے یہ دونوں راستے حج کے لئے بند ہو گئے ہیں۔"

"مُلّا عبداللہ سلطان پوری کو یہ علم تھا کہ اکبر جس کسی سے ناراض ہوتا ہے اُسے حج کے لئے بھیج دیتا ہے۔ مُلّا صاحب فتویٰ دے کر پیشگی بندوبست کر رہے تھے کہ انہیں حج پر نہ بھیجا جائے اور شاہ حسین نے اسی لئے شیخ الاسلام کو سربازار کہا تھا" تو نے حج اور زکوٰۃ چھوڑ دی، میں نے نماز اور روزہ چھوڑ دیا۔ دورکن تو نے چھوڑے دورکن میں نے۔ لیکن میں سزا کا مستحق ہوں مگر تو سزا کا مستحق نہیں۔ بتا کیسے؟"

اور اسی شیخ عبداللہ سلطان پوری کے بارے میں مولانا عبدالقادر بدایونی لکھتا ہے "اس نے علماء و مشائخ اور بالخصوص پنجاب کے مستحق لوگوں پر بہت زیادتیاں کی تھیں۔"

مخدوم الملک کی وفات (۹۹۱ھ) کے بعد گجرات کے گورنر قاضی علی نے ان کے گھر کی جعلی قبروں میں دفن جو سونا چاندی نکلا تھا اس کی مالیت اس وقت تین کروڑ روپے کی تھی۔"

اکبر بادشاہ

جب علی کوتوالؒ شاہ حسین کو اکبر بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کی بجائے خود ہی جان ہار گیا، جب مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری بھی حسین کو سزا دینے میں ناکام ہوا اور اسے حسین کے دیئے جام نے ہی بے بس کر کے رکھ دیا تو پھر اکبر نے اپنے حکام کو حکم دیا کہ وہ بہر صورت شاہ حسین کو دربار میں پیش کریں اور پینے پلانے کی حالت میں پیش کریں۔ ۔ ۔ ۔ افسران ماتحت شاہ حسین کی تلاش میں نکلے۔ انہیں بھی یہی خطرہ تھا کہ حسین ان کے قابو میں نہیں آئے گا۔ علی کوتوال کی طرح ان کی سعی بھی رائیگاں جائے گی اور ممکن ہے اس ناقص کارکردگی پر ان کی جان بھی مصیبت میں پھنس جائے، اگر ایک طرف بادشاہ کا خوف تھا تو دوسری طرف انہیں حسین کے قہر کا بھی ڈر تھا۔ حسین کے غیر معمولی کردار نے اہل شہر نے اپنی بزرگی تو پہلے ہی تسلیم کرا رکھی تھی، جب وہ معمول کے مطابق زندگی گزار رہے تھے تو زہد وعبادت کے سبب باعثِ احترام سمجھے جاتے تھے اور جب انہوں نے شیخ سعد اللہ کے درس سے ناچتے گاتے کنارہ کشی کی اور پہلے ہی مرحلے پر کتاب کو جو کنوئیں میں ڈال دی گئی تھی، حکم دے کر باہر نکالا اور اپنے ہم سبقوں کو دے دیا۔ جنہوں نے کنوئیں میں گرنے کے باوجود کتاب کو خشک پایا تو پھر سارے شہر میں ان کی اس کرامت کا چرچا ہوا اور یوں انہیں مختصر مدت میں ایک بلند مرتبہ حاصل ہو چکا تھا۔ ۔ ۔ ۔

ایسی عجیب شخصیت کو گرفتار کرنے میں سو طرح کے خطرے اور وسوسے تھے۔ دوسری طرف بادشاہ کے حکم کی تکمیل کا مسئلہ۔۔۔۔۔

لیکن اتفاق کی بات کہ اب کے بادشاہ کے کارندوں کو علی کو توال ایسا تجربہ نہیں ہوا شاہ حسین نہ صرف آسانی سے مل گئے بلکہ انہوں نے شاہ کے دربار میں جانے پر بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔۔۔ جس طرح مخدوم الملک کے سامنے حاضر ہونے میں انہوں نے دیر نہیں لگائی تھی البتہ شاہ نے ان کارندوں سے یہ ضرور کہا کہ فقیروں کا دربار سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ ان دونوں میں بُعد المشرقین والمغربین ہوتا ہے اس لیے وہ انہیں دربار میں نہ لے جائیں تو بہتر ہے۔۔۔۔ کارندوں نے اپنی مجبوری بتائی کہ انہیں پیش نہ کیا گیا تو خود ان کی خیر نہیں۔ چنانچہ شاہ حسین اپنے سامانِ نشاط کے ساتھ کشاں کشاں دربار کو چل پڑے۔

بادشاہ کو علی کو توال کا قصہ بھی معلوم تھا اور مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری والی واردات سے بھی آگاہی تھی۔ بادشاہ یہ بھی جانتا تھا کہ حسین نے زندگی کے چھتیس برس کس طور گزارے ہیں۔ بادشاہ کو اس بات کی بھی خبر تھی کہ حسین کی تربیت جس مردِ خدا یعنی بہلول دریائی نے کی ہے وہ کون تھا؟ دُلا بھٹی کے علاقے میں کیوں قیام پذیر رہا؟ بادشاہ باخبر تھا کہ حسین نے شہر میں کس کس سے تعلیم اور تربیت حاصل کی، گویا بادشاہ جس استاد کی عظمت کا بڑا معترف تھا یعنی شیخ سعداللہ کا ان کے حوالے سے بھی حسین کا واقف تھا کہ ایسے عالم استاد کے سامنے حسین نے قرآن کی ایک آیت کی کیا تعبیر کی اور پھر کس طرح اس آیت کی روشنی میں پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر تھیا تھیا ناچنے لگا تھا۔۔۔ مختصر یہ کہ اکبر بادشاہ حسین کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا ان کی غیر شرعی حرکات کو پسند نہیں کرتا تھا اور غالباً انہی حرکات سے حسین کو تائب کروانا چاہتا تھا۔

جب شاہ حسین اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ دربار میں پیش کیا گیا، جن کے پاس شیشہ و جام بھی تھا اور چنگ و رباب بھی، یہ حالت دیکھ کر اکبر نے اہلِ دربار کی طرف منہ کر کے پوچھا کہ بتاؤ کہ مذہب، دین اور سلوک یعنی تصوف میں یہ چنگ و رباب اور شیشہ و جام کیسے روا ہیں؟

سرِراہ شراب خوری اور فسق و فجور کی کہاں اجازت ہے ؟ کہاں فقر اور کہاں مستی اور اوباش لوگوں کی صحبت ؟ یہ کھُلا الحاد ہے اور شریعت کے سراسر خلاف ۔

بادشاہ نے اشارۃً براہِ راست حسین کو بھی سوال کیے اور اس سے پیشتر کہ کوئی اہلِ دربار میں سے بولے خود حسین بول پڑے : اے بادشاہ جو ظاہر میں نظر آتا ہے سب کچھ وہی نہیں اس لیے اس ظاہر سے پرے بھی دیکھنے کی سعی کر۔

باطنِ اہلِ فقر راست یقیں　　　چہ شناسند قومِ ظاہر بیں

لوگ فقیروں کے بھید کو نہیں جانتے کیونکہ فقر کا یہ بھید انہیں معلوم ہی نہیں کہ وہ اشیا کے ظاہر سے ہٹ کر ان کے اندر کی کیفیت کو جان ہی نہیں سکتے ۔ میں تو شراب نہیں پیتا ۔ مخدوم الملک بھی میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا اور پھر میں نے اسے بھی اس شے کے سات جام دیئے تھے جسے لوگ شراب کہتے ہیں ۔ مخدوم موجود ہے اس سے پوچھ لے کہ اس نے شراب ہی پی تھی ؟ یا وہ شراب کے لطف سے ہی محروم ہے ۔ اور اب میں خود تجھے سات نہیں آٹھ جام دوں گا تو بادشاہ ہے شراب کے سب ذائقے جانتا ہے ۔

اس کے ساتھ ہی حسین نے جام میں شراب ڈالی اور بادشاہ کے ہاتھ میں جام تھما دیا ۔ ۔ ۔ شاہ نے جام لیا ، دیکھا تو سیال شے شراب ہی لگی مگر جب ہونٹوں سے لگائی تو بے ساختہ کہا کہ یہ تو پانی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ حسین نے کہا کہ میرے جام و صراحی میں تو یہی کچھ ہے اور اس کے ساتھ ہی اس صراحی میں سے دوسرا جام بھرا اور بادشاہ کو دیا اور کہا کہ یہ وہ شراب نہیں جو تجھے مدہوش کر دے گی ۔ شاہ نے مسکراتے ہوئے یہ جام بھی لیا اور جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ نہ شراب ہے نہ پانی بلکہ دودھ ہے ۔ ۔ ۔ بادشاہ بہت حیران ہوا کہ ایک ہی صراحی سے ایک جام پانی کا اور دوسرا دودھ کا کیسے ممکن ہے وہ ابھی اسی حیرت کے عالم میں تھا کہ حسین نے تیسرا جام پُر کیا ، بادشاہ نے غور سے دیکھا اور چکھا تو آب کے شربت تھا اور ایسا شربت جو سر کا درد دور کرنے کے لیے دیا جاتا ہے ۔ شاہ حسین نے پھر اسی صراحی میں سے چوتھا جام بھرا اور حیرت زدہ بادشاہ نے انگور کا سرکہ پیا۔

اگلی بار جام قہوے سے بھرا تھا۔ چھٹا جام چائے کا تھا اور ساتویں بار حسین نے جو جام بادشاہ کو دیا وہ عرق گلاب کا تھا۔۔۔۔ اور آخری یعنی آٹھواں جام شراب کا جام تھا۔۔۔۔ یوں ایک ہی صراحی سے خالص پانی، دودھ، شربت، انگور کا سرکہ، قہوہ، چائے، عرق گلاب اور شراب نکال کر حسین نے بادشاہ کو پلا دی۔ بادشاہ نے حسین سے پوچھا کہ ایک ہی صراحی سے آٹھ مشروب نکالنے کا راز کیا ہے۔ حسین نے کہا:

گفت بگذر ازیں و ہیچ مپرس ۔ وحدتِ فقر بیں و ہیچ مپرس

(اس بات کو چھوڑ اور مجھے ایسی بات مت پوچھ، فقر کی وحدت کا جلوہ کر اور کوئی سوال نہ پوچھ۔)

بھرے دربار میں اکبر کو حیران و ششدر چھوڑ کر حسین نے باہر کا راستہ لیا مگر اکبر نے بآواز بلند کہا اس شخص کو مت جانے دینا۔ درباریوں نے دوڑ کر حسین کو پکڑ لیا اور پھر شاہ کے سامنے لے آئے، بادشاہ نے کہا حسین تیری یہی کرامات ہیں، اور کیا انہی مشروبات سے تو نے مخدوم کو لاجواب کیا تھا۔۔۔ تو نے دراصل کمال چالاکی سے یہ سارا کرتب دکھایا ہے اور دونوں جگہوں پر ایک سا مظاہرہ کیا ہے۔۔۔ کسی بھی کرامت کا مکرر ہونا مجھے منظور نہیں۔ اس لئے مجھے کوئی اور بات دکھا۔ مجھے یہ مکر، حیلہ اور فن پسند نہیں آیا۔

بادشاہ نے شاہ حسین سے کہا اور حکم دیا کہ حسین اگر اس وقت کوئی اور کرامت نہیں دکھاتا تو اسے قید خانے میں بند کر دیا جائے، زنداں کا دروازہ اس وقت تک کھولا نہ جائے جب تک یہ ہماری فرمائش پوری نہ کرے۔۔۔ اتنا کہنے کی دیر تھی کہ ان بندگان خدا نے حسین کو قابو کیا اور قید خانے میں بند کر دیا اور جس کوٹھڑی میں حسین کو قید کیا گیا اس کے اردگرد سخت پہرہ بٹھا دیا۔۔۔۔

حسین کے معاملے کے بعد اکبر بادشاہ نے دوسرے امور سلطنت سرانجام دیئے۔ پھر دربار برخواست ہوا۔ رات کو اکبر اپنے حرم میں گیا تو کیا تماشا دیکھتا ہے کہ حسین عورتوں کے مجمع

میں کھڑے ہیں۔ کبھی اس عورت سے لپٹتے ہیں کبھی کوئی اور اُن سے لپٹ جاتی ہے، اسے حیرت ہوئی کہ یہ درویش یہاں کیسے پہنچ گیا۔ پہلے سوچا وہم ہے، پھر پشیمان ہوا اور فوراً قید خانے کو آدمی دوڑائے۔ جنہوں نے پہرے داروں کو پوچھا حسین کو چھوڑ دیا گیا۔ انہوں نے پورے یقین کے ساتھ کہا کہ اندر ہے اور دروازے میں تالا پڑا ہے ..... انہوں نے تالا کھولا اور حیران رہ گئے کہ کوٹھڑی میں حسین نہیں ہے .....

شاہ کو حقیقت کا علم ہوا تو پورے شہر میں حسین کو ڈھونڈنے کا حکم دیا۔

بادشاہ کے حکم کے مطابق پورا شہر چھان مارا گیا مگر شاہ حسین کا نام و نشان نہ ملا۔ دوسری طرف بادشاہ جب پھر حرم میں گیا تو شاہ حسین کو دیکھا، ایک ستون کے ساتھ لگے کھڑے تھے اس کے بعد شاہ حسین بادشاہ کے شبستان میں پہنچ گئے۔ بادشاہ حسین کے یہ روپ دیکھ کر گھبرا گیا اور شاہ حسین سے پوچھا کہ اے مردِ حق میں یہ کیا کچھ دیکھ رہا ہوں، یہ کیا بھید ہے۔ شاہ حسین نے کہا کہ بادشاہ جو تو دیکھ رہا ہے صحیح دیکھ رہا ہے۔ بجا کہ یہ ممکن کام نہیں مگر فقیروں کے لیے کوئی شے محال نہیں۔ تو نے میری آزمائش کا کیا کیا سامان نہیں کیا لیکن اللہ نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچنے دیا۔ اس لیے اب بھی تجھ سے یہی کہتا ہوں کہ مجھے خوشی خوشی جانے دے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہیئے کیونکہ اسی میں خود تیرا نقصان ہے، تو نے ملک علی کا انجام دیکھ لیا، مگر افسوس تو نے اس سے بھی سبق حاصل نہیں کیا، میں اگر چاہوں تو ابھی تمہاری جان لے سکتا ہوں، مگر میں تیری طرح نہیں ہوں کہ اس بنا پر تجھے نقصان پہنچاؤں کہ تو نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اگر بادشاہ خدا کا سایہ ہوتا ہے تو پھر فقیروں پر زیادتی نہیں کیا کرتا۔ بہر طور میں تو فقیر آدمی ہوں، میرا یہ مذہب نہیں کہ تم جیسے لوگوں کو کوئی نقصان پہنچاؤں۔ میں ایسی کوئی حرکت کر کے اپنے خدا کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے اگر اب تم اپنی سلامتی چاہتے ہو تو مجھے جانے دو، مجھے پھر کبھی اپنے دربار میں نہ بلانا نہ مجھ سے کرامات دکھانے کا تقاضا کرنا۔ میں متقی ہوں یا فاسق تمہیں اس کی تصدیق کرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ تیرا کام ہی نہیں

اور اگر تو نے پھر کوئی ایسی حرکت کی تو یہ تمہارے لیے بھی نامبارک ہوگی۔ میری یہ نصیحت ہمیشہ یاد رکھو۔۔۔۔۔ میں اس وقت خدا کی پناہ میں جا رہا ہوں۔

شاہ حسین نے یہ الفاظ کہے اور اس کے بعد بادشاہ کی نگاہ سے غائب ہوگیا۔ شاہ وہیں حیرت زدہ کھڑا رہا۔۔۔ شاہ نے دلیل کی یہ عملی صورت دیکھی تو بہت حیران ہوا۔ اگلے روز اس نے رات کا سارا قصہ اپنے وزیر ابوالفضل کو سُنایا۔ شیخ ابوالفضل نے بادشاہ سے کہا کہ اے بلند اقبال یہ فقیر لوگ خدا تو نہیں ہوتے مگر خُدا سے جُدا بھی نہیں ہوتے۔ جب یہ توحید سے آگاہ ہو جاتے ہیں تو ان کے لیے اطاعت اور گناہ بے معنی چیزیں بن جاتی ہیں۔ گناہ و ثواب کی دوئی ان کی نظر میں ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک سبھی افراد برابر ہوتے ہیں۔ ان کے لیے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

اکبر بادشاہ نے ملک علی کوتوال کے قصے، مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کے واقعے اور اپنے سامنے والی وارداتوں کے حوالے سے شاہ حسین کو دیکھا تو دل پر شاہ حسین کی ہیبت بیٹھ گئی۔ وہ شاہ حسین کا معتقد ہو گیا اور اگرچہ پھر کبھی اسے دربار میں نہیں بلایا اور خود بھی مصلحت کے تحت اس کے پاس نہیں گیا مگر اس کی رضا حاصل کرنے کا اہتمام ضرور کیا کرتا تھا اور جب کبھی ملک کے کسی حصے میں شورش ہوتی یا گردن فراز راجوں کو مطیع کرنے کے لیے لشکر بھیجتا تو شاہ حسین سے دعا کا خواستگار ہوا کرتا۔۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ جب کبھی شاہ حسین نے شاہی لشکر کی کامیابی کی دعا کی اسے کامیابی نصیب ہوئی۔

اکبر بادشاہ کے اس اعتقاد کے بعد اس کے خواص و عام شاہ حسین کے عقیدت مند ہو گئے۔

سب سے پہلے تو شاہزادوں نے نیازمندی دکھائی۔ شہزادہ سلیم دن اور رات میں جب بھی موقع ملتا حسین کے حضور حاضر ہو جاتا۔

شاہ حسین کے بارے میں تقریباً ساری کتابیں اور سارے محقق اس بات پر متفق ہیں کہ شہزادہ سلیم اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنے ایک انشاپرداز ملازم بہار خان کو یہ فرض سونپ دیا کہ وہ مستقلاً شاہ حسین کے ساتھ رہے اور ان کے فرمودات اور واقعات کو تحریر

میں لاتا رہا۔ بہار خان نے یہ روزنامہ تیار کیا۔ اس کا نام "بہاریہ" رکھا گیا۔۔۔۔ یہ کتاب اب ناپید ہے مگر تحقیقات چشتی کے مصنف نور احمد چشتی نے لکھا ہے کہ اس نے نہ صرف بہاریہ دیکھی بلکہ اس میں سے حسین کے بارے میں واقعات بھی نقل کئے۔

چشتی نے ہی لکھا ہے کہ "اکبر نے ایک فرمان اس مضمون کا جاری کیا کہ حضرت حسین کہ باطن میں افسر فقرائے زمانہ ہیں اسی طرح ظاہر میں بھی سرگروہ خیل فقرائے باب اللہ مقرر ہوئے ہیں۔ اگرچہ ظاہر حضرت مرحوم (شاہ حسین) اس طرف متوجہ ہوئے مگر باعث شہرہ کرامت پر ایک فقیر اپنے آپ کو زیر حکم حضرت کے رکھنا چاہتا تھا اور جو کچھ جھگڑا خرخشہ کسی مکان دار کا ہوتا تھا تو وہ سب روبروئے حضرت کے فیصلہ پاتا تھا۔"

"اور ماسوا اس کے حضور اکبر سے واسطے مصارف خدام عالی مقام کے حضرت کو بہت سی معافیات بطور نذر عطا ہوئیں چنانچہ ان کے فرامین بھی موجود تھے مگر بوقت تباہی سلطنت و بادشاہ گری وہ اسناد درہم برہم ہو گئیں اور بوقت یورش احمد شاہ ابدالی چند فرامین شاہی بزرگان سجادہ نشین نے بخانہ حضرت نظام شاہ جو فقیر مست نامی لاہور میں تھے اور حال ان کا حال میانی صاحب میں متصل درج ہے، رکھے ہوئے تھے کیونکہ وہ اس جناب کے پشت در پشت مرید و خادم چلے آتے تھے جب احمد شاہ آیا اور شہر کو قتل کر کے اکثر مکانات کو جلایا تو اس وقت میں وہ فرامین بھی ضائع ہو گئے۔"

محمد پیر لکھتا ہے کہ شہزادہ سلیم کے علاوہ شہزادہ دانیال اور شہزادہ مراد بھی شاہ حسین کے عقیدت مندوں میں شامل تھے اور حرم کی خواتین بھی شاہ حسین سے عقیدت رکھتی تھیں۔۔۔ اکبر کے جن وزیروں اور امراء نے شاہ حسین سے عقیدت و وابستگی کا اظہار کیا ان میں سے کچھ کے نام محمد پیر نے گنوائے ہیں۔ شیخ ابوالفضل، خواجہ دولت خان، شیخ عبدالرحمٰن، خان خاناں مرزا عبدالرحیم، خان اعظم۔۔۔۔ آصف خان جعفر بیگ، زین خان کوکلتاش، شہباز خان کنبوہ اور بے بدل موسیقار تان سین۔

داراشکوہ کے حوالے سے نقوش لاہور نمبر میں لکھا ہے "شہزادہ سلیم اور حرم سرائے اکبری کی اکثر بیگمات شیخ حسین کی عقیدت مند تھیں۔"

ہم عصر بزرگ، دوست، پیر بھائی

ابو اسحٰق قادری ، داؤد شیر گڑھی، شیخ ختو تیلی
موسے کھوکھر، شیخ ارزانی ، مادھو لال،
مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی ، خان خاناں، جوگی
معتقد اور ہم مجلس

ابو اسحٰق قادری

محمد پیر نے شاہ حسین کے جن دو بزرگ صوفیوں اور ساتھیوں کا ذکر کیا ہے ان میں ایک شیر گڑھ اوکاڑہ والے شیخ داؤد ہیں اور دوسرے لاہور کے ابو اسحٰق ۔ دونوں کے دونوں بے مثال اور منفرد عظمت کے صوفی اور استاد تھے ۔

هست بے شک حسین مردِ خدا | عاشق درد مند روے خدا
کوست بار از کباب رود و شراب | از مےٗ فقر و عشق حق سیراب
یک در باطن از رہ عرفاں | با خدا بود یک دل و یک جاں
شیخ داؤد و شیخ ابو اسحاق | ہر دو باہم یگانہٗ آفاق
آن گرفتہ ۔ ۔ ۔ موطن | ایں گرفتہ بہ بہادر مسکن
ہر دو بودند یارِ شاہ حسین | محرم کار و بارِ شاہ حسین
کہ ہمیشہ بعالم باطن | ہر سہ بودند ہم درم باطن
کہ ہمی خواندہ اند در بطحا | ایں سہ یاراں نماز ہا یک جا

(ان تینوں بزرگوں (شیخ داؤد، شیخ ابو اسحاق اور شاہ حسین) میں انتہائی قریبی رابطہ تھا"

ایک دوسرے کے ظاہر و باطن سے کلی طور پر آگاہ تھے۔ ایک دوسرے کے محرم اسرار تھے، ایک (شیر گڑھ) میں تھے اور دوسرے لاہور میں مگر تینوں اکٹھے بطحی میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔)

شیخ ابو اسحاق لاہور کے بارے میں محمد اسحٰق بھٹی نے فقہائے ہند کی جلد سوم میں لکھا ہے:

"شیخ ابو اسحٰق بن حسین قادری لاہوری عالم اجل اور صالح بزرگ تھے۔ تحقیقات چشتی میں ہے کہ بخارا سے آئے تھے اور شیخ ابو المعالی اور ابو اسحٰق، شیخ داؤد کے مرید تھے۔

شیخ داؤد بن فتح اللہ جہنی وال (موجودہ نام چونیاں) سے اخذ طریقت کیا۔ ان سے عرصہ تک منسلک رہے بعد ازاں لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اپنے دور کے عالم کبیر اور تفسیر قرآن میں ماہر تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے "منتخب التواریخ" میں ان کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

شیخ ابو اسحٰق لاہوری حضرت میاں شیخ داؤد کے خلیفہ تھے اور اپنی تیز رفتاری میں مشہور تھے ان کے دل میں مرشد کی محبت جاگزیں تھی۔ تغیرات زمانہ اور انقلابات دوراں سے ہمیشہ بے نیاز رہے ان کو دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی اور دل میں خدا کی طلبی کا جذبہ جاگ اٹھتا تھا۔ بلاشبہ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔

"ان کے بس دو تین رفیق تھے ان کے علاوہ نہ کسی سے ملتے اور نہ کسی کو اپنے ہاں بلاتے پیری مریدی کا کوئی سلسلہ نہیں رکھا تھا ہمیشہ ایک حجرے میں جو ایک باغ میں تھا گوشہ نشین رہتے۔ شیخ داؤد جہنی وال سے ملاقات کا اشتیاق ہوتا تو لاہور سے پیدل نکل جاتے اور ایک رات میں چالیس کوس کا فاصلہ طے کر کے شیر گڑھ پہنچ جاتے اور ان کو ملے بغیر واپس آجاتے۔

"ایک سال میں بھی لاہور میں ان بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور ان کے ہاں ایک رات اور ایک دن مہمان رہا۔ دوسرے دن شیر گڑھ کے لیے صرف ایک محافظ کے ساتھ روانہ ہو گیا حالانکہ وہ زمانہ نہایت خطرناک تھا۔ راستے میں راہزن اور لٹیرے میرا راستہ روک لیتے اور حیران ہو کر پوچھتے کہ اس خطرناک جنگل میں تم تن تنہا کیوں جا رہے ہو۔ میں جیسے ہی جواب میں یہ کہتا کہ میں شیخ ابو اسحاق کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اب شیخ داؤد کے پاس شیر گڑھ جا رہا ہوں تو وہ ان کا نام سن کر عقیدت

احترام سے پیش آتے۔ کھانے پینے کے لیے دودھ دہی وغیرہ لے آتے اور رات بتا کر احتیاط و حفاظت کے لیے کہتے کہ جہاں کوئی خطرناک آدمی ملے اس کو شیخ ابو اسحٰق کا نام بتادینا۔ جس سال شیخ داؤد نے انتقال کیا اس کے کچھ ہی عرصہ بعد شیخ ابو اسحٰق بھی ۹۸۵ھ) انتقال کر گئے۔ مفتی غلام سرور لاہوری "خزینۃ الاصفیا" میں لکھتے ہیں۔

"شیخ مروجہ علوم میں مہارت رکھتے تھے، تفسیر، حدیث اور فقہ کے عالم تھے اور اپنی خانقاہ میں ان علوم کی باقاعدہ تعلیم دیتے تھے۔ تمام عمر لوگوں کی ہدایت میں مصروف رہے اور خلقِ کثیر نے ان سے علمی اور روحانی فیوض حاصل کیے۔"

نقوش کے لاہور نمبر میں محمد دین فوق کی تحریر ہے کہ "آپ لاہور میں آکر اسی جگہ مقیم ہوئے بلکہ اسی مقام پر جہاں آپ کا مزار بنا ہوا ہے۔ آپ اور شاہ ابو المعالی پیر بھائی تھے۔ شاہ ابو المعالی کو جب اُن کے چچا اور مرشد (شیخ داؤد) نے لاہور جانے کا حکم دیا تو آپ نے بھی اسی محبّت کی بنا پر جو آپ کو شاہ ابو المعالی سے تھی لاہور جانے کی اجازت طلب کی چنانچہ آپ لاہور تشریف لے آئے۔"

آپ کا قیام اس محلہ میں اتنی مدت تک رہا کہ اس کا نام ہی محلہ شاہ ابو اسحٰق مزنگ مشہور ہو گیا تھا۔ شاہ بلاول آپ کی خانقاہ میں چند سال تک مقیم رہے ہیں اور یہیں قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ جہاں آپ کا قیام تھا وہ جگہ لاہور سے دو میل کے فاصلے پر تھی لیکن لوگ کھنچے چلے آتے تھے ..... نور احمد چشتی نے آپ کے مزار پر گنبد بھی دیکھا اور پچاس قبریں بھی۔ لوح مزار پر یہ شعر پڑھا گیا۔

حضرت شیخ شاہ ابو اسحٰق   بود چوں از خدا، خدا طلبش

گوشہ شمالی مغرب میں ۹۸۵ھ درج ہے

محمد دین فوق لکھتے ہیں (چشتی کے اسی برس بعد ۱۹۴۴ء میں) نہ چوبی پنجرہ نہ پچاس قبریں بلکہ دروازہ کے متصل صرف تین قبریں موجود ہیں۔ خدا جانے وہ بھی کس طرح سلامت رہ گئی ہیں۔

شیخ داؤد شیر گڑھی

جہاں حقیقت الفقراء میں محمد پیر نے شیخ داؤد شیر گڑھی اور شیخ ابو اسحاق لاہوری سے شاہ حسین کی نیاز مندی یا دوستی کا ذکر کیا ہے وہاں بعض دوسرے شواہد بھی ان تینوں کے مراسم کے گمان کو یقین میں بدلتے نظر آتے ہیں۔ ابو اسحاق قادری مسلک رکھتے ہیں۔ شاہ حسین کا مسلک بھی یہی تھا اور شیخ داؤد کرمانی کا بھی۔ پھر شاہ حسین کے معروف استاد شیخ سعداللہ نے لاہور میں ابواسحق قادری سے اکتساب علم کیا تھا اور بلاشبہ شیخ سعداللہ جیسے شاگرد پر کسی بھی استاد کو ناز ہو سکتا ہے شاہ حسین حضرت ابواسحاق قادری سے عمر میں خاصے چھوٹے تھے۔ روایت کے مطابق کم و بیش چالیس سال کا فرق تھا۔ شیخ ابو اسحاق قادری اور شیخ سعداللہ کے حوالے سے شاہ حسین کی شیخ داؤد کرمانی شیر گڑھی سے وابستگی یقینی ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک اور مضبوط واسطہ ایسا بھی ہے جو صرف شیخ داؤد اور شاہ حسین کے درمیان الگ سے قائم ہوتا ہے۔ شاہ حسین نے اپنی شاعری میں کسی غیر ملکی عشقیہ داستان یا اس کے کرداروں کا سہارا نہیں لیا۔ پنجاب کے عشق کا قصہ ہیر رانجھا واحد قصہ ہے جس کے کرداروں کو حسین نے اپنے شاعرانہ اظہار کے لیے برتا اور کرداروں کے حوالے سے اپنی ذات کی کچھ اس طرح شناخت کرائی کہ جو طرح حسین پنجابی شاعری میں ڈال گئے بعد میں

آنے والوں نے اسی کو معتبر جانا۔۔۔۔ شاہ حسین ہیر بن کر رانجھا سے وصال کے آرزومند ہے
اور ان کے بعد آج تک پنجابی کا شاعر خود کو "ہیر" ہی کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

ماہی ماہی کوکدی میں آپے رانجھن ہوئی
رانجھن رانجھن مینوں سب کوئی آکھو ہیر نہ آکھے کوئی

(میں ماہی ماہی پکارتی خود ہی رانجھا بن گئی ہوں، اب مجھے سب لوگ رانجھا کے
نام سے پکاریں، کوئی شخص مجھے ہیر نہ کہے)

شاہ حسین کے ہاں متعدد کافیوں میں ہیر رانجھے کا ذکر آیا ہے۔ جیسے

لوکاں سُنیاں، دلیاں سُنیا، ہیر ہیر اگن ہوئی
اک سینڈا، لکھ سُنے، میرا کیا کرے گا کوئی

میں بھی جھوک رانجھن دی جانا، نال میرے کوئی چلے

نی مائے، مینوں کھیڑیاں دی گل نہ آکھ

رانجھن سانوں گنڈیاں پائیاں دل وچ لگیاں زور

ہاتھی عشق، مہاوت رانجھا، انکس دے دے ہوڑیئے

رانجھن جوگی، میں جوگیانی۔۔۔۔

جے توں تخت ہزارے دا سائیں، اسیں سیالاں دیاں کڑیاں

ندیوں پار رانجھن دا ٹھانہ، کیتا قول ضروری جانا

مہیں آئیاں، میرا ڈھول نہ آیا، ہیر کوکے وچ جھنگے

اس وقت تک جو تحقیق ہوئی ہے اس کے مطابق شاہ حسین اس علاقے کی کسی بھی معروف زبان فارسی، سندھی، اردو اور پنجابی کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ہیر رانجھے کے قصے کا ذکر کیا اور ان دو کرداروں کے حوالے سے اپنی شاعری کا تانا بانا بُنا اور صوفی بزرگوں میں سے ممکن ہے پہلے بھی کسی نے ہیر رانجھے کے حوالے سے بات کی ہو مگر ہمارے علم میں نہیں، شیخ داؤد کرمانی اولین صوفی ہیں جنہوں نے ہیر رانجھا کے کرداروں کے بارے میں اپنی رائے دی۔ محمد آصف خان نے "ہیر دمودر" کے دیباچہ میں "مقاماتِ داؤدی" کے حوالے سے لکھا ہے۔

"حضرت مخدوم شاہ داؤد کرمانی کے پاس ایک شخص آیا اس نے میاں رانجھا اور مائی ہیر کا تذکرہ کیا۔ حضرت نے فرمایا: تم نے نیک لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری آئندہ پانچ نسلوں پر کرم کیا ہے۔" آصف خان نے یہ حوالہ بلال زبیری کی کتاب "جھنگ کی کہانیاں" سے لیا ہے سید محمد حیدر مقاماتِ داؤدی کے حوالے سے لکھتے ہیں "ان (شیخ داؤد) کے گاؤں میں ایک مغنی تھا جس کا نام دلیا تھا۔ ایک روز وہ اپنے ساز پر دھن پہ گاتا ہوا شیخ داؤد کے مکان کے پاس سے گزرا۔ گانے کا مفہوم یہ تھا کہ میں نے مقدس بزرگوں کی بارگاہوں پر قربانیاں پیش کیں۔ اور چڑھاوے چڑھائے تھے۔ جب کہیں میرا محبوب میرا رانجھا میرے گھر آیا تھا اور پھر میں نے اس کے ساتھ بیاہ رچایا تھا۔ میں نے کسی قاضی اور مُلا کو نہ بلایا کہ آکے اسلامی شریعت کے مطابق عقد نکاح باندھے۔" جونہی شیخ داؤد کے کانوں میں یہ بول پڑے انہوں نے گھر سے نکل کر جنگل کی راہ لی اور کتنی دنوں تک وہیں گھومتے رہے۔

شیخ داؤد اور شاہ حسین میں ایک تیسرا مگر منفی رابطہ بھی نظر آتا ہے اور وہ اکبر کے مخدوم الملک

عبداللہ سلطان پوری ہیں جنہوں نے شیخ داؤد اور شاہ حسین پر غیر شرعی حرکات کا الزام لگا کر انہیں بھی شیخ علائی کی طرح فنا کرنا چاہا۔ یعنی اہل شریعت یا شرعی پاسداروں کی نظر میں دونوں صوفی گردن زدنی تھے۔۔۔۔

شیخ داؤد، شاہ حسین سے عمر میں بہت بڑے تھے جب ان کا انتقال ۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) میں ہوا اس وقت شاہ حسین کی عمر ۳۰ برس تھی یعنی انہیں مسجد میں سے رقص کناں نکلے اور شہر میں چنگ و رباب اور رامش و رنگ سے سیراب ہوتے تقریباً ایک سال ہو چکا تھا۔ حسین کی ابتدائی زندگی میں شاہ داؤد کرمانی لاہور آتے رہے۔

داؤد کرمانی کے والد فتح اللہ کرمان سے آئے اور سیت پور (ضلع مظفر گڑھ) میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد جھنی وال یا جھنی وال (جسے اب چونیاں کہا جاتا ہے) میں آ گئے۔ داؤد، سید محمد حید کے مطابق ۲۷ رمضان المبارک میں ۹۱۹ھ میں سیت پور میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ ست گھرا (ضلع ساہیوال) کے حافظ محمد کی بیٹی تھیں جو ان کے ماموں بھی تھے۔ والد پیدائش سے چند ماہ پہلے انتقال کر گئے۔ والدہ ان کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد کوچ کر گئیں۔ اس کے بعد ان کے بھائی چچاؤں کو چھوڑ کر ماموں کے پاس ست گھرا میں آ گئے۔

اعجاز الحق قدوسی "صوفیائے پنجاب" اور سید محمد حیدر "احوال الشیخ داؤد جھنی وال (۱۹۳۱ء)" میں لکھتے ہیں شیخ داؤد کی پرورش ان کے بڑے بھائی نے کی، کچھ عرصہ جھنی وال میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور میں معروف استاد شیخ اسماعیل بن عبداللہ (وفات ۹۸۸ھ) کے شاگرد ہوئے۔ شیخ اسماعیل نے مولانا عبدالرحمٰن جامی سے علوم ظاہری کا اکتساب کیا تھا جس پر انہیں بڑا فخر تھا شیخ اسماعیل نے کہا "جس طرح ہمیں اس پر فخر ہے کہ ہماری ملاقات مولانا جامی سے ہوئی اور ہم نے ان سے علمی اکتساب کیا۔ اسی طرح یہ شاگرد (شیخ داؤد) بھی شہرت، قبولیت اور بزرگی کے اس مقام پر فائز ہوگا کہ لوگ اس سے ملنے پر فخر کریں گے۔"

تعلیم کے زمانے میں شیخ داؤد کی یہ حالت تھی کہ تمام رات اس طرح نماز میں گزارتے کہ کبھی ساری

ساری رات قیام میں رہتے کبھی تمام رات رکوع میں گذر جاتی اور کبھی تمام شب سجدے میں پڑے رہتے۔ چند سال آپ نے اس طرح صحرا میں گذار دیے کہ دنیا اور اہل دنیا سے آپ کو تعلق نہ تھا......۔ شیخ داؤد نے بڑی ریاضتیں کیں۔ آپ دیپال پور کے صحرا میں ننگے پاؤں اور ننگے سر پھرا کرتے تھے۔ سوائے جنگل کے پرندوں اور جانوروں کے کوئی آپ کا ساتھی نہ تھا۔ ان ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد شیخ داؤد نے شیر گڑھ ضلع (اوکاڑہ) میں سکونت اختیار فرمائی۔

مولانا عبدالحق محدث دہلوی صاحب اخبار الاخیار کا بیان ہے کہ وہ مجلس میں اس طرح مضطرب اور حیران بیٹھے رہتے جیسے وہ شخص بیٹھتا ہے جس کی کوئی چیز گم ہو جاتی ہے یا کوئی شخص اپنے محبوب کے انتظار میں ہوتا ہے پھر اچانک ان پر ذوق و شوق کی کیفیت طاری ہو جاتی اور حقائق و معارف بیان کرنے پر آتے تو نہایت ہی حکیمانہ نکتے بیان کرتے۔

جب شیخ داؤد شیر گڑھ میں ارشاد و تلقین میں مصروف تھے وہ زمانہ سلیم شاہ سوری کی بادشاہت کا زمانہ تھا۔ مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کا ستارہ اقبال سوریوں کے زمانے میں بھی عروج پر تھا وہ سلیم شاہ کے عہد میں مذہبی امور کے صدر الصدور تھے۔ مخدوم الملک کے دست احتساب سے شیخ داؤد گڑھی بھی نہ بچ سکے۔ غالباً مخدوم الملک کے مشورے سے فرمان جاری ہوا کہ شیخ داؤد دربار میں حاضر ہوں چنانچہ اپنے دو ایک ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ گوالیار کے باہر مخدوم الملک سے ملاقات ہوئی۔ بات چیت کے دوران مخدوم الملک نے آپ سے پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کے مرید ذکر کرتے وقت 'یا داؤد، یا داؤد' کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا غالباً سننے والے کو اشتباہ ہوا ہے۔ وہ 'یا ودود یا ودود' کہتے ہوں گے۔ آپ نے مخدوم الملک کو کچھ نصیحتیں بھی فرمائیں اور شیر گڑھ واپس ہو گئے۔

شیخ قطب عالم جو اس زمانے کے سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ تھے ان کا بیان ہے کہ جب میں شیخ داؤد کی خدمت میں پہنچا تو ان کے واعظ و نصیحت کے طریقے کو دیکھ کر میرے دل میں خیال گذرا کہ کہیں شیخ مہدوی تو نہیں۔ یہ خیال میرے دل میں گزرا ہی تھا کہ انہوں نے میری طرف مخاطب ہو کر

بغیر کسی سابقہ تقریب کے فوراً ہی میرے اس خیال کی واضح طور پہ تردید کردی۔

"مُلا عبدالقادر بدایونی صاحب منتخب التواریخ ایک مرتبہ شیر گڑھ میں آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہوئے اور دو تین روز آپ کے پاس مقیم رہے وہ شیخ داؤد کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شیخ کے جمال میں کوئی ایسی چیز نظر آتی تھی جس سے دنیا کے صاحب جمال محروم ہیں۔ گفتگو اور تبسم میں چہرے پر ایسا نور چمک اٹھتا تھا کہ دلوں کی تاریکیاں دور ہو جاتی تھیں اور وجہ اللہ کا بھید عیاں ہو جاتا تھا۔

"بے نیازی اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ اکبر بادشاہ نے جب پنجاب میں وہ تھا شہباز خان کنبوہ کو آپ کے پاس بھیجا اور تمنا ظاہر کی کہ وہ آپ کے پاس آئیں لیکن آپ نے معذرت کرتے ہوئے کہلا بھیجا کہ میں یہاں بھی دُعاگو ہوں جو میں کر سکتا ہوں وہ یہاں بیٹھے ہوئے بھی کر رہا ہوں۔ ان کے تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ وہ اعلائے حق امر بالمعروف میں شمشیر برہنہ تھے۔۔۔ ان صوفیان خام اور علمائے سوء سے سخت بیزار تھے جنہوں نے علم اور تصوف کے پردے میں دنیا طلبی اور حب جاہ کو اپنا مقصد بنا رکھا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ جن علماء نے بادشاہوں اور امیروں کو اپنا قبلہ بنا لیا ہے ان سے وہ مکھی ہزار درجہ بہتر ہے جو نجاست پر بیٹھی رہتی ہے اور یہ شعر پڑھتے۔

دردستِ فقیر نیست نقدے جُز وقت

آں نیز اگر دست دہد وائے برا ُو

سید محمد حیدر مرحوم نے ۱۹۳۱ء میں پنجاب یونیورسٹی کے لئے شیخ داؤد پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ سید محمد حیدر چونکہ اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کے اس مقالے سے بعض اقتباسات بے جا نہ ہوں گے۔

"شیخ داؤد کے والد سیت پور (ضلع مظفر گڑھ) میں مقیم تھے۔ سید فتح اللہ کو یہ شوق دامنگیر ہوا کہ ام البلاد لاہور کے شہرۂ آفاق علماء سے استفادہ کریں۔ اس سفر کے دوران وہ میر جا کر کی

بستی دست گھرا) میں بھی آئے۔ شیخ فتح اللہ نے (والدین کی اجازت کے بعد) میاں محمد حافظ کی بیٹی سے شادی کر لی جو حافظ معزالدین کے لڑکے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ حافظ معزالدین، ملتان شہر کے مشہور مفتی تھے۔ اس بیوی کے بطن سے دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ بڑے لڑکے کا نام سید رحمت اللہ اور چھوٹے کا نام داؤد۔

"ست گھرا میر چاکر رند کی بستی تھی۔ لاہور، ملتان کی قدیم شاہراہ پر ۔ ۔ ۔ میر چاکر رند مقامی سردار تھا۔ سبی کے علاقے سے آیا تھا اور قوم کا بلوچ تھا دشمنوں نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ شور کوٹ کے حاکم بایزید نے اسے ست گھرا کا علاقہ دے دیا ۔ ۔ ۔ یہ بات یقینی ہے کہ شیر شاہ سوری کے حکم کی تعمیل میں لاہور کے گورنر ہیبت خان نیازی کی زیر قیادت پہاڑی پٹھانوں نے بلوچوں پر حملہ بول دیا اور ست گھرا اور اس کے نواح میں بلوچوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ اس طرح میر چاکر رند کا دور حفظ و امن لد گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب شیخ داؤد اور ان کے رشتہ داروں کے لئے شیر گڑھ کے نئے گاؤں کی طرف منتقل ہو جانا ضروری ہو گیا تھا۔ یہ نیا ڈیرہ ان کی ترک کردہ بستی سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر تھا۔

"مقامات داؤدی کے حوالے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے دیپالپور (جہاں تعلیم کے لیے گئے تھے) کو چھ مہینے کے اندر اندر چھوڑ دیا۔ نیز یہ کہ بصیر پور کے لوگ ان بھائیوں (رحمت اللہ اور شیخ داؤد) کے حسنِ اخلاق اور دیگر خوبیوں سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے ان سے اپنے قصبے میں قیام کرنے کی استدعا کی۔ بصیر پور میں کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ مزید تعلیم کے حصول کی خاطر لاہور کی جانب چل دیئے۔

"مرزا کامران (پسر بابر) کے زمانے میں شیخ داؤد لاہور میں مقیم تھے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لاہور میں ۱۵۳۰ء کے بعد یعنی اس وقت تھے جب بابر وفات پا چکا تھا۔ اس طرح شیخ داؤد کا لاہور میں وارد ہونا اور یہاں مقیم ہونا سولہویں صدی عیسوی کی ابتدائی تین دہائیوں کا واقعہ ہونا چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔

"شادی کے وقت ان کی عمر ستائیس برس تھی۔۔۔۔ اس شادی کے فوراً بعد بلکہ اس سے پہلے بھی وہ عبادت و استغفار کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ کئی کئی دن گھر سے غائب رہتے تھے اور بڑی بے چینی اور سرمستی کے عالم میں قریبی جنگلوں میں سرگرداں رہتے تھے۔"

مرزا کامران کے دربار میں ایک ایرانی عالم آیا جس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ بہت بڑا ماہر علوم ہے اس نے ہند کے ماہر الٰہیات و مذاہب کو بعض مختلف فیہ مسائل کے باب میں دعوتِ مناظرہ دی اس مناظرے میں حصہ لینے کے لیے مرزا کامران نے دیپالپور سے مُلا بایزید کو بلا بھیجا۔ شیخ داؤد ان مُلا بایزید مذکور کے شاگرد تھے۔ وہ اس مناظرے کی تیاری میں استاد کی معاونت کر رہے تھے اور اس سلسلے میں لاہور کے ایک باغ میں کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھے کہ ایک درویش نے انہیں مخاطب کر کے کہا اللہ! اللہ نے تمہیں کس کام کے لئے پیدا کیا تھا اور تم کس راہ پڑ گئے ہو۔ ۔۔۔ طالب علم کی حیثیت سے وہ صاحب کمال تھے ہی چنانچہ اب طالب علمانہ زندگی کو خیر باد کہہ دیا۔ لباس چاک کیا اور ایک دنیا دار انسان کی زندگی سے قطع تعلق کر کے اپنا مسکن جنگل کو بنا لیا۔

"انہوں نے موجودہ لاہور کی بستی اچھرے میں بھی چند سال بسر کئے۔۔۔۔ شاہراہ لاہور ملتان جلال وال جنگل میں اساسی عبادت اور ریاضت کی تکمیل کی۔

"مختصر یہ کہ خواہ وہ لاہور میں تھے خواہ ست گھرا میں خواہ شیر گڑھ میں انہوں نے اپنی زندگی صحرا نشینی میں بسر کر دی۔۔۔۔ کبھی یوں بھی ہوتا اپنے سر کے بال استرے سے بالکل صاف کرا دیتے تاکہ گاؤں کے لڑکوں بالوں کو انہیں کنکریاں مارنے کی ترغیب ہو اور وہ اُن کا ٹھٹھا اڑائیں تاکہ ان کی انا ختم ہو جائے۔

"جہاں تک شیخ کی عادات و خصائل کا تعلق ہے یہ کہنا پڑتا ہے کہ شیخ مسلمانوں کی بہ نسبت جینیوں اور نصرانیوں سے زیادہ قریب تھے وہ کسی حیوان یا انسان کو اذیت دینے کے قائل نہ تھے۔"

بدایونی نے رائے ظاہر کی ہے کہ "شیخ کی نفس کشی اور دریادلی کا یہ عالم تھا کہ سال میں دو تین بار ہر وہ شے جو ان کے پاس ہوتی خواہ نقد، خواہ جنس غرباء میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ان کی اور ان کی اہلیہ کی ملکیت مٹی کا ایک مرتبان، ایک پرانا مصلیٰ اور سر چھپانے کو ایک کمرہ تھا۔

شیخ داؤد کے دعوے کے مطابق جو قبائل کلی یا جزوی طور پر ان کے مرید ہوئے اور دائرہ اسلام میں داخل ہوئے وہ یہ ہیں۔ ضلع گوجرانوالہ، ورک، چھٹے، تارڑ، سنجرا، دھوتار، چیمے وڑائچ، گورائے، مان، سانسی ۔۔۔۔ ضلع سیالکوٹ میں باجوے، بسرے، چیمے، گھمن، کاہلوں، گورائے، ساہی، سندھو، ضلع ساہیوال اراڑ، حصیانے، کولاکھے، مجھیانے، مردانے، بلوچ۔

جنوبی پنجاب میں اس زمانے میں تصوف کے دو بڑے سلسلوں کے مرکز بن چکے تھے، ملتان میں سہروردی سلسلہ تھا جبکہ پاک پتن میں بابا فرید گنج شکر کے حوالے سے تصوف کا چشتی سلسلہ ان سے آگے شمال کی طرف شیخ داؤد قادری سلسلہ کا ستون بن گئے۔ شاہ حسین کا قادری سلسلہ حضرت بہلول دریائی سے جاری ہوا۔ پھر ان کا تعلق شیخ داؤد اور شیخ ابو اسحٰق قادری سے رہا جو دونوں قادری سلسلے کے سربرآوردہ بزرگ ہیں۔ شاہ حسین نے بادشاہوں سے لاتعلقی کا اصل انداز شیخ سعد اللہ اور شیخ داؤد ہی سے سیکھا تھا۔ شیخ داؤد اور شاہ حسین پیر بن کر رانجھے کے سے تڑپنے کو زندگی کا خاص الخاص مقصد جانتے تھے۔

حسّو تیلی ...... حسّو حسین اور حسین حسّو

شاہ حسین کے عہد میں ان سے عمر میں ذرا بڑے بزرگوں میں شیخ حسّو تیلی بھی تھے، چوک جھنڈا لاہور میں ان کی دکان تھی، شاہ جمال میں ان کا مزار ہے وہ شاہ حسین سے چھ برس پہلے ۱۰۰۲ھ میں فوت ہوئے "تاریخ لاہور" میں کنہیا لال ہندی نے لکھا ہے "کہتے ہیں کہ حضرت لال حسین کے ساتھ اس کی کمال محبت تھی اور کہا کرتا تھا کہ حسّو حسین ہے اور حسین حسّو ہے دوئی باقی نہیں ہے۔"

نور احمد چشتی نے شاہ حسین اور شیخ حسّو تیلی کے تعلقات کے بارے میں "سیر العارفین" کے حوالے سے لکھا ہے ..." حضرت حسّو تیلی اور حضرت مادھو لال حسین ہم عہد ہیں۔ طریقہ حضرت لال حسین کا مجذوبانہ، قلندرانہ تھا وہ اسی راہ سے جہاں مکان حضرت حسّو تیلی کا تھا شور و غل کناں بمزار پیر علی مخدوم گنج بخش ہجویریؒ آیا جایا کرتے تھے۔ ایک روز حضرت حسّو تیلی نے ان کو فرمایا کہ اے لڑکے اتنا شور و غل مچاتا ہوا یہاں سے نہ جایا کر اور نیز اپنے حاشیہ نشینوں سے فرمایا کہ یہ شخص کبھی مجلس نبویؐ میں مجھ کو نظر نہیں آیا اور یہاں ناحق اس قدر شور و غل مچاتا ہے۔ حضرت لال حسین نے ان کی تقریر پر کچھ توجہ نہ فرمائی اور بدستور اسی راہ سے آمد و رفت رکھی حتیٰ کہ تین روز اسی طرح گزر گئے۔

"بعد اس کے ایسا اتفاق ہوا کہ ایک شب حضرت حسّو مجلس نبویؐ میں حاضر تھے (دیکھتے تھے) کہ اس دربار میں ان کو خدمت پوری کرنے کی تھی؟) یکایک کیا دیکھتے ہیں کہ ایک لڑکا خورد سال آکر جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں بیٹھ گیا ہے آنحضرتؐ اس کو پیار کرتے ہیں بعد اس کے وہاں سے اُٹھ کر حضرت حسّو تیلی کی خدمت میں آ بیٹھا۔ انہوں نے بلحاظِ جناب نبویؐ اس لڑکے کو گود میں لیا۔ اس لڑکے نے حسبِ عادتِ طفلاں خورد سال حضرت کی داڑھی پر ہاتھ مار کر چند بال اکھیڑ لیئے۔

"پھر ایک روز حضرت لال حسین شور و غل مچاتے ہوئے چوک جھنڈا سے گزرے۔ حسّو تیلی نے وہی سخن مقرر فرمایا۔ یہ سُن کر حضرت حسین کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے کہ میاں تم اس بات سے باز نہیں آتے۔ آؤ ادھر دیکھو۔ جب وہ پاس آئے تو وہی بال جو مجلس نبویؐ میں انہوں نے ریش مبارک حسّو تیلی صاحب سے اکھاڑے تھے ان کو دکھائے وہ دیکھ کر پہچان گئے کہ بے شک یہ وہی لڑکا ہے جو گود مبارک نبویؐ میں بیٹھا تھا اور آنحضرت شاہِ رسالت اس سے پیار کرتے تھے بعد اس کے آپ نے ان کو چھاتی سے لگایا اور غلبۂ محبت سے فرمایا۔ حسّو حسین ہے اور حسین حسّو۔ اور ارشاد کیا کہ جو شخص ہمارا خادم ہووے وہ حضرت لال حسین کا ادب پیروں کی طرح کرے چنانچہ اب تک یہ خانقاہ حسّو تیلی صاحب کی متعلق اسی خانقاہ کے ہے اور وہاں کا سجادہ نشین جس کو چاہے یہاں بٹھا دے اور کُل تیلی وغیرہ خدام حضرت حسّو تیلی کے حضرت لال حسین کے خدام کا ادب کرتے ہیں۔"

موسے کھوکھر

"تحقیقاتِ چشتی" کے مطابق حضرت بہلول دریائی کے چار خلفاء تھے۔ شاہ حسین (لاہور) موسے کھوکھر (لاہور) شیخ ارزانی دیوان (پٹنہ) اور صدو انصاری (قصور)۔ ۔ ۔ ۔ "حقیقت الفقرا" میں شیخ ارزانی اور شیخ صدو کا ذکر موجود ہے۔ شیخ ارزانی کے شاہ حسین کی زندگی اور بعد از مرگ مکالمہ اور اسے پٹنہ پہنچانے کا قصہ الگ باب میں ہے۔ شیخ صدو کے بارے میں حقیقت الفقرا میں لکھا ہے:

اندریں روزگار شیخ صدو ہمت از مخلصانِ خاصۂ او

در سوادِ قصورِ افغاناں ہست با جمع از خدا داناں

محمد پیر نے لکھا ہے کہ جب وہ شاہ حسین کے سوانح لکھ رہا تھا ان دنوں شاہ کے ساتھیوں میں سے صرف شیخ صدو زندہ تھا اور لاہور کی بجائے قصور میں رہتا تھا۔ موسے کھوکھر کا ذکر محمد پیر نے نہیں کیا۔ مگر تحقیقات چشتی میں ان کا ذکر موجود ہے۔ ان حضرت موسے صاحب کا ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی صاحبزادی کا ناطہ حضرت شاہ محمد مقیم حجرہ والا سے کیا۔ جب شادی شروع ہوئی تو آپ نے سُنا کہ ہمراہ برات خلق کثیر جمع ہو گی۔ آپ اس سے متردد ہوئے کہ ہمارے

پاس کچھ زرِ نقد نہیں اور برات بہت بھاری آوے گی۔ لاچار ہو کر حضرت مادھو لال حسین کے گئے اور جا کر حالِ اضطراب اپنا بیان کیا۔ انہوں نے براہِ مہربانی مٹی کی ایک ہانڈی ان کو دی اور فرمایا کہ جاؤ بر وزِ برات جو کچھ تم کو مطلوب ہوگا اس ہانڈی سے طلب کر لینا۔ قدرتِ الٰہی ان کو اس بات پر اعتماد نہ ہوا۔ واسطے امتحان کے گھر آ کر اس ہانڈی سے کچھ کچھ طلب کرنا شروع کیا۔ الغرض جو جو طلب کیا موجود پایا۔ جب شادی ہو چکی تو وہ فتوحات بند ہو گئیں۔ اس پر انہوں نے بہت افسوس کیا اور بخدمت فقیر مادھو لال حسین جا کر حال بیان کیا۔ وہ خاموش رہے پھر انہوں نے دوبارہ عرض کی کہ یا مولیٰ کارِ شادی سے تو بوجہ احسن فراغت ہو گئی ہے اب مجھے بیت اللہ جانا ہے اگر باعزت و آبرو جاؤں تو لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔ آپ مہربانی کر کے اس کا بندوبست مجھے کر دیں۔ اس وقت حضرت مقام فی مع اللہ وقت میں تھے۔ یکایک بول اٹھے اس وقت قبولیت کا دروازہ وا ہے جس کے گھر میں بیٹا نہ ہو وہ ایک روپیہ نذرانہ لاوے جنابِ الٰہی سے اسے فرزند عنایت ہوگا۔ یہ سن کر ہزارہا لوگ نذرانہ لے کر حاضر ہوئے آپ نے جس کا روپیہ لیا اسی سال جنابِ الٰہی سے اس کو فرزند عطا ہوا۔ الغرض زرِ مطلوبہ اسی وقت جمع کر کے ان کو دے دیا۔

چشتی کے اس بیان میں ایک نمایاں غلطی ہے اور وہ یہ کہ موسے کھوکھر کی بیٹی کی شادی شاہ محمد مقیم حجرہ والا سے کم از کم شاہ حسین کی زندگی میں نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ چشتی کے اپنے کہنے کے مطابق شاہ محمد مقیم ۱۰۱۳ھ میں پیدا ہوئے جبکہ شاہ حسین کا انتقال ۱۰۰۸ھ میں ہو چکا تھا۔ خود موسے کھوکھر کا انتقال ۱۰۲۵ھ میں یعنی شاہ مقیم کی پیدائش کے بارہ برس بعد ہو گیا۔ یقیناً چشتی صاحب کو شاہ محمد مقیم کے بارے میں مغالطہ ہوا ہے۔

موسے کھوکھر کی قبر چشتی کے مطابق غرب رویہ مائل بہ شمال محکمہ عدالتِ خفیہ لاہور کے جنوب رویہ میڈیکل کالج قدرے بلند زمین جس پر ایک کلاں درخت بوڑھ سایہ فگن ہے متصل درخت ایک قبر پختہ قدرے بوسیدہ۔ یہ قبر حضرت موسے کھوکھر کی ہے۔

شیخ ارزانی ۔۔۔۔ لاہور سے پٹنہ تک

شیخ بہلول دریائی کے فقیروں میں سے ایک شیخ ارزانی کے نام سے مشہور تھے، پنجاب میں کسی مقام پر ان کا قیام تھا، بہت پڑھے لکھے، مجرّد، کرامات ان کی بھی بہت مشہور تھیں مگر کہیں نہ کہیں انہیں خیال ہوا کہ حسین ان سے بہت آگے نکل گئے ہیں یا یہ کہ انہیں زیادہ شہرت ملنی چاہیئے یا یوں کہ لاہور ایسے صدر مقام میں اگر وہ حسین کو زیر کر سکیں تو ان کو کمال عروج حاصل ہوگا، بہر طور کوئی ایسی ہی بات تھی کہ وہ لاہور آئے، شاہ حسین کی زندگی کے آخری دنوں کی بات لگتی ہے، شاہ حسین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دونوں ایسے ہی ملے جیسے پیر بھائی ملتے ہیں۔ شاہ حسین نے خاطر مدارات کی۔ ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا، دونوں نے اپنے مرشد شیخ بہلول کو یاد کیا، اپنی اپنی منزل سلوک کا حال بیان کیا۔

شیخ ارزانی دراصل جس نیت سے آیا تھا، اس کا اندازہ حسین کو ہوگیا۔ شیخ ارزانی حسین سے مقابلہ کرنا چاہتا تھا اور حسین نہیں چاہتے تھے کہ اس قسم کی امتحانی مشق کی جائے۔ یہ حسین کے مزاج کی بات نہ تھی۔ دوسرے غالباً حسین کو یہ بھی اندازہ تھا کہ شیخ ارزانی کو ایک بہتر مقام کی خواہش ہے اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے وہ خود کو حسین سے زیادہ باکمال دکھانا چاہتا

ہے۔ اس طرح حسین کی زندگی میں ہی نہیں موت کے بعد بھی اسے لاہور میں مقام حاصل رہے گا۔

حقیقت الفقراء کے مطابق شیخ ازرانی نے حسین سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم اور میں باطنی طور پہ زور آزمائی کریں اور یہ دیکھیں کہ کون خدا کے زیادہ قریب ہے۔ حسین نے مسکرا کر دیکھا اور پھر کہا کہ اگر یہی مقصود ہے تو پھر مجبوری ہے۔ شیخ ازرانی نے کہا کہ میں غائب ہوتا ہوں اور مختلف صورتوں میں اپنا آپ ظاہر کروں گا۔ تم میں ہمت ہے تو مجھے پکڑ لینا۔۔۔۔ شیخ ازرانی جس روپ میں گیا حسین نے سراغ لگا لیا اور یہ بھی کہا کہ یہ کام تو جوگی لوگ بھی کر لیتے ہیں۔ فقیروں کو یہ زیب نہیں دیتا۔۔۔۔ اس طرح حسین نے جوگیوں اور شعبدہ بازوں کے پورے فن کو رد کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ان سے جو کچھ سرزد ہوتا ہے یا منسوب ہے اس کا جوگیوں اور شعبدہ بازوں کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔

شاہ حسین اور شیخ ازرانی میں مقابلے کا شروع یوں ہوا کہ شیخ ازرانی ایک تیتر بن کر اُڑے دوسرے لمحے حسین نے شہباز کی شکل اختیار کی اور تھوڑی دیر میں تیتر (ازرانی) کو جا لیا۔ حسین نے ازرانی سے کہا کہ اگرچہ اب تو میرے بس میں ہے اور میں تجھے تحت الثریٰ تک پہنچا سکتا ہوں مگر نہ یہ میرا مسلک ہے اور نہ ہی ہمارے مرشد بہلول کا یہ طریق تھا۔ تاہم بزرگی یا خدا سے قربت کا تقابل نہیں کیا کرتے، ہمیں کوئی اپنی عظمت دکھانا مقصود نہیں، ہم نے تو خاک نشینی اختیار ہی اس لئے کی ہے کہ گردن فرازی سے ہماری مخاصمت ہے۔ بہرطور اب تم میری تلاش کر کے دیکھ لو۔

محمد پیر کے مطابق حسین اپنی جگہ سے اُٹھے اور کنگرۂ عرش پر جا پہنچے۔ ازرانی کے ذمے حسین کی تلاش تھی، ازرانی نے بہت پرواز کی، چاروں اور حسین کو ڈھونڈا اور اس دعوے کے ساتھ ڈھونڈا کہ حسین اس سے چھپ کر کہیں جا نہیں سکتا اور یہ کہ حسین سمیت ہر شے اس کی پہنچ میں ہے۔ شیخ ازرانی کے غرور کو بڑے زور کا دھچکا لگا اور وہ تھک ہار کر واپس آ گیا۔ اس نے

اپنی ہار کا اعتراف کیا اور تب حسین نے واپس آکر ارزانی سے کہا کہ وہ ان کا پیر بھائی ہے اسے مرشد بہلول کے مسلک کے فروغ کی خاطر پنجاب چھوڑ دینا چاہیئے۔ پٹنہ میں اس کا انتظام کیا جا رہا ہے جہاں اسے بے شمار عقیدت مند ملیں گے۔ شیخ ارزانی نے حسین سے مقابلے کے بعد حسین کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا اور کہا کہ حسین کا کوئی جواب نہیں۔ ارزانی نے حسین کی یہ بات بھی مان لی کہ وہ پٹنہ چلا جائے گا۔

شیخ ارزانی واپس اپنے علاقے میں چلا گیا، پٹنہ جانے کی بجائے وہ حسین سے ایک بار پھر زور آزمائی کرنے پر تُلا ہوا تھا مگر حسین کی زندگی میں اب یہ زور آزمائی مُمکن نہ تھی۔ تاہم شیخ ارزانی یہ طے کر چکا تھا کہ اسے لاہور میں حسین کے برابر اپنا مقام پیدا کرنا ہے اور حسین کے چھوڑے روحانی ورثے کو بھی اپنی میراث بنانا ہے، حتمی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا مگر خیال ہے کہ شیخ ارزانی موت کے بعد حسین کا جانشین بننا چاہتا تھا جبکہ حسین اس مقصد کے لئے بہت پہلے مادھو کو منتخب کر چکے تھے۔ شیخ ارزانی نے حسین کی موت کے بعد جو انداز اختیار کیا اس سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

جب ۱۰۰۸ھ میں حسین کا انتقال ہوا تو اس کے کچھ عرصہ بعد شیخ ارزانی پھر لاہور میں وارد ہوا اسی اثنا میں وہ سیاحت میں مصروف رہا۔ جب وہ حسین کی قبر پر پہنچا تو اس نے عجیب وغریب انداز اختیار کیا۔ اس نے حسین کی قبر کو ٹھڈے مارے اور کہا "اے جولاہے تو اب خاک نیچے مردہ پڑا ہے، نہ تجھے میرے آنے کی خبر ہے اور نہ ہی اپنے آپ کی۔ اگر اب تو اپنے حال سے آگاہ ہے تو دیکھ کہ میں شیر ہوں اور تو گیدڑ ہے۔"

شیخ ارزانی کی یہ بات سُن کر قبر کے اندر سے شاہ حسین کی آواز آئی "ارزانی تو یہ کیسی بات کر رہا ہے، مجھے تجھ سے اس سخن کی توقع نہ تھی، ہر چند میں زیرِ زمین سو رہا ہوں مگر واقف ہوں تو میری خاک کو پامال کر رہا ہے، تو بڑا کینہ پرور ہے اور اسی وجہ سے میری قبر کی بے حرمتی کر رہا ہے۔ اگر میں اپنے حال سے آگاہ نہ ہوتا تو یقیناً میں اللہ سے بھی آگاہ نہ ہوتا۔ میں جولاہا

ہوں مگر میں جوئے اللہ (اللہ کی تلاش) بھی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ تو جانتا ہے کہ شیر کون ہے اور لومڑی کون۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو اس سے اندازہ کر سکتا ہے کہ میں تہہ خاک ہوں مگر زبان رکھتا ہوں، تیری بات کا جواب دیتا ہوں۔ تو میرے مرشد بہلول کا مرید ہے۔ ۔ ۔ ۔ مجھے زیب نہیں دیتا کہ میں بھی کینے کے تحت تجھے کچھ کہوں یا تیرا بُرا چاہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو نے میری قبر کو ٹھڈے مارے۔ مجھے تعصب کی بنا پر جولا ہا کہا۔ تو نے کیسی جہالت دکھائی ہے، فقیر لوگ اہل اللہ تو ایسا نہیں کیا کرتے ۔ ۔ ۔ ۔ تو کم از کم مجھے یہ تو بتا کہ میرا قصور کیا ہے جس کی بنا پر تو مجھ سے جنگ آزما ہے۔ میں چاہوں تو تجھے خوفناک سبق دے سکتا ہوں، مگر میرا یہ مسلک نہیں۔ میرا منشا یہ ہے کہ تو بھی روشن ضمیر بہلول کا مرید ہے۔ میرا بھائی ہے۔ تجھ پہ لازم ہے کہ تو اپنے پیر کا نام روشن کرے اور اس خاندان (بہلول دریائی) کو ایسی رونق دے کہ تو بھی میرے موافق اور برابر ہو جائے، اب تجھ پر لازم ہے کہ لاہور سے چلا جائے اور ہندوستان کے شہر پٹنہ میں جا کر اپنا ڈیرہ ڈالے۔ اس وقت شاہ بہلول بھی میرے پاس موجود ہیں۔ ان کا بھی یہی حکم ہے کہ تو لاہور سے کوچ کر جائے سرزمین پٹنہ تیری منتظر ہے۔

شیخ ارزانی یہ باتیں سن کر بڑا پشیمان ہوا، ندامت کے باعث اس نے مزار پہ خدمت شروع کر دی۔ چلہ بھی کھینچا اور بقول نور احمد چشتی "اب تک وہ مکان چلہ اس شیخ مرحوم کا بگوشہ باب خانقاہ حضرت مرحوم کے موجود ہے۔" شاہ حسین کے مزار پہ عقیدت مندوں کے ہجوم، شاہی دربار کی طرف سے احترام، عوام کا رجوع یہ سب ناظر شیخ ارزانی کے لیے لاہور چھوڑنے میں مانع تھے مگر شاہ حسین چاہتے تھے کہ ارزانی لاہور چھوڑ جائے۔ انہوں نے ارزانی سے کہا بھی کہ وہ پٹنہ چلا جائے مگر ارزانی لاہور میں حسین ہی کے مزار پہ جا رہا۔

محمد پیر کی روایت کے مطابق شاہ حسین نے اکبر بادشاہ سے خواب میں ملاقات کی اور بتایا کہ ایک ہم مرشد شیخ ارزانی ان کے مزار پہ جا بیٹھا ہے۔ میرے مرشد شیخ بہلول بھی کہتے ہیں کہ وہ لاہور چھوڑ کر پٹنہ چلا جائے، وہاں اس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ مگر وہ لاہور ہی میں رہنے کے لئے

بہانے تراشتا رہتا ہے حالانکہ دو بار اس نے اقرار کیا کہ وہ پٹنہ چلا جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ مگر پھر مکر جاتا ہے اس لیے اب اسے لاہور سے پٹنہ بھیج دیا جائے۔

اگلی صبح اکبر بادشاہ نے خواب کے مطابق عمل کیا اور شیخ حسین کے مزار سے جو حقیقت الفقراء کے مطابق اس وقت دریائے راوی کے اس پار شاہدرے کے قریب تھا۔ شیخ ارزانی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ شیخ ارزانی سے ساری تفصیل معلوم کرنے کے بعد اس نے لاہور شہر کے ناظم کو حکم دیا کہ وہ شیخ ارزانی کو شاہ حسین کے مزار سے لے کر پٹنہ پہنچا دے۔ اکبر کے حکم کے سامنے سرتابی کی کس کو مجال ہو سکتی تھی اور اس پر یہ حکم شاہ حسین کی فرمائش پر دیا گیا تھا جس نے دربار میں طلبی کو بھی اپنے لئے باعث ننگ سمجھا تھا آج وہی شاہ حسین اکبر بادشاہ کے ذریعے شیخ ارزانی کو اپنے مزار سے اٹھوا رہا تھا۔

لاہور شہر کا ناظم مزار پر پہنچا۔ شیخ ارزانی کے حجرے میں شیخ سے ملا اور اسے بتایا کہ اکبر بادشاہ اسے پٹنہ بھیجنا چاہتا ہے۔ اس لیے فی الفور تیار ہو جائے تاکہ اُسے محافظوں کے ساتھ پٹنہ پہنچایا جائے۔ شیخ ارزانی کو بخوبی علم ہو گیا کہ یہ نقل مکانی کس کی خواہش کے مطابق ہو رہی ہے اور اس کا وسیلہ کون بنا ہے۔ یعنی حسین نے ایک ایسے ذریعے سے شیخ ارزانی کو پٹنہ پہنچانے کا اہتمام کیا جس کے سامنے ارزانی انکار نہیں کر سکتا تھا اور بہلول یا حسین کے مریدوں کے حوالے سے جس کی حیثیت غیر جانبدارانہ تھی۔ ۔ ۔ ۔ اکبر کے حوالے سے جب شیخ ارزانی شاہ حسین کے مزار سے رخصت ہونے لگا تو مزار سے لپٹ کر بہت رویا۔ اپنی گستاخیوں کی معافی چاہی اور کہا کہ اگرچہ لاہور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا مگر آپ کے حکم کے مطابق پٹنہ جاتا ہوں۔ آپ میرے حال سے بے خبر نہ رہیں یعنی میری خبر رکھیں گے کہ میں آپ کا خادم اور نائب ہو کر وہاں جاتا ہوں۔ شیخ ارزانی کو مزار سے بڑی عزت سے رخصت کیا گیا اور اسی عزت و احترام کے ساتھ شاہی ملازموں نے اسے پٹنہ پہنچا دیا۔

پٹنہ پہنچنے پر شیخ ارزانی کا فیض عام ہوا، نام بھی روشن ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں شیخ کے

حوالے سے بہلول اور حسین کے ماننے والوں کی تعداد دو لاکھ ہو گئی۔ نور احمد چشتی کی تحریر کے مطابق شیخ ارزانی کا انتقال حسین کے انتقال کے سات برس بعد ۱۰۱۵ھ میں پٹنہ میں ہوا۔ گویا شیخ ارزانی وہاں پر بمشکل پانچ چھ برس رہا ہوگا۔ چشتی نے ۱۸۶۴ء میں اسی باب میں یہ بھی لکھا ہے کہ "مدن شاہ سادھو اس کے دوست اور غم گسار ہیں پیشہ تجارت ہے ان سے معلوم ہوا کہ ناف شہر پٹنہ میں بمقام محلہ سلطان گنج گنبد علی شان مزار حضرت شیخ ارزانی کا زیارت گاہ خلق اللہ ہے اور مقبرہ پر کار کاشی و چینی بدرجہ کمال خوشنما ہوا ہے۔ وہ مقبرہ جہانگیر نے بنوایا تھا اور اب تک اس کی معافیات کا وہاں یہ حال ہے کہ محاصل سرکار دے کر پچاس ساٹھ ہزار روپیہ خدام کو ملتا ہے اور سجادہ نشین وہاں کا فی زمانہ شیخ عبداللہ صاحب ہیں۔ ان کے گھر میں وہ شان و شوکت ہے کہ نصیب راجگان نہ ہوتی ہو گی اور خانقاہ مبارک پر دو تین ہزار فقیر حاضر رہتے ہیں۔"

مطبع نظامی بدایوں سے ۱۳۳۰ھ میں مولوی عبدالحئی صدیقی کی کتاب "تذکرۃ الصلحا۔ تاریخ احسن میں درج ہے کہ "شیخ ارزانی، خلیفہ شیخ فتح اللہ حقانی جونپوری، قادری، پٹنہ۔ وفات ۱۲ رجب ۱۰۷۲ھ۔

مادھولال سے عشق کی داستان

اس وقت تک شاہ حسین کی معلوم شاعری میں مادھولال کا ذکر صرف ایک بار آیا ہے۔

پیارے لال کیا بھروا سہ دم دا
اڈیا بھور، تھیا پردیسی، اگے راہ اگم دا

(پیارے لال، اس دم کا کوئی بھروسہ نہیں، پنچھی (روح) اڑا، پردیسی ہوا اور آخرت کی طرف پرواز کی)۔

مگر مادھو کے لاحقہ کے بغیر عوامی سطح پر شاہ حسین کو کوئی نہیں پہچان سکتا۔ حسین کا اس وقت معروف نام "مادھولال حسین" ہے یعنی ایک تہائی مادھو اور ایک تہائی حسین اور ایک تہائی لال جو دونوں میں مشترک ہے جہاں حسین دفن ہیں وہیں مادھو کو دفن کیا گیا۔ حقیقت الفقراء مصنف محمد پیر مادھو کا مرید تھا، مادھو کا انتقال ۱۰۵۷ھ میں یعنی شاہ حسین کی وفات سے اڑتالیس برس بعد ہوا اگرچہ مادھو کو شاہ حسین کے ساتھ ہی دفن کیا گیا تھا مگر مادھو کے انتقال کے چھ برس بعد جب داراشکوہ نے "حسنات العارفین" لکھی تو اس میں مادھو کا ذکر نہیں اور حسین کا نام شیخ حسین ڈاھڈا لکھا، محمد پیر نے شاہ حسین کے جو حالات زندگی لکھے ان میں بھی حسین کو شیخ حسین

یا شاہ حسین لکھا، مادھو لال حسین نام بہت بعد کی بات معلوم ہوتا ہے مگر ایک طویل عرصہ سے یہی نام مقبول رہا اور اب عوامی سطح پر ان دونوں کی الگ الگ شناخت ہی ختم ہو چکی ہے۔

مادھو لال، شاہدرہ کے ایک برہمن خاندان کا خوبرو نوجوان تھا جو اٹھارہ سال کی عمر کا تھا کہ کہیں ایسی جگہ سے گزر ہوا جہاں شاہ حسین جن کی عمر چھپن سال تھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ عالم سکر میں موجود تھے، پہلی ہی نظر میں حسین گھائل ہوئے اور دوستوں کے ساتھ مادھو کے گھر پہنچ گئے، مادھو شادی شدہ تھا۔ ایک برہمن لونڈے کے عشق میں اس حد تک ڈوب جانے سے شاہ حسین کے بارے میں طرح طرح کی باتیں اڑیں اور وہ شخص جس نے چھپن برس کی عمر تک شادی نہ کی نہ اس کے عشق کی داستان کسی نے سُنی، جو شب و روز اپنے حال میں مست شہر میں گھومتا پھرتا تھا، جسے نہ علی کوتوال زیر کر سکا نہ اکبر اور اس کا مخدوم الملک مُلّا عبد اللہ سلطان پوری جس کی عقیدت مند شاہی حرم کی معزز خواتین تھیں، جس کے اقوال تحریر میں لانے کے لیے شہزادہ سلیم نے اپنا خاص آدمی بہار خان مقرر کر رکھا تھا جو اپنی ایک نہیں بے شمار کرامات کی بنا پر پورے شہر میں ایک خاص انداز کی آزادی و سرمستی کی علامت بن چکا تھا، جو دن بھر شعر و موسیقی اور شراب میں ڈوبا رہتا تھا اور رات کو راوی کے پانی میں کھڑے ہو کر پورا قرآن ختم کر دیا کرتا تھا، حسین کی خدمت میں دربار اکبری کے رتن حاضری دینا سعادت سمجھا کرتے تھے، اس شخص کا ایک نوجوان برہمن زادہ غیر مسلم لڑکے کے عشق میں اس حد تک گزر جانا معمولی واقعہ نہ تھا، اس لئے حسین کے بارے میں اگر اس وقت کے لاہور شہر میں طرح طرح کی باتیں ہوئی ہوں گی تو یہ کوئی غیر معمولی نہیں فطری بات تھی۔ مگر شاہ حسین نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی، جس طرح ان کے استاد شیخ سعد اللہؒ کو آخری عمر میں ایک طوائف کے عشق نے بے طور کر دیا تھا اور انہوں نے بھی اس کوچۂ ملامت سے قدم واپس نہیں پھیرا۔ اسی طور شاہ حسین بھی مادھو کے عشق میں شاہدرہ کی گلیوں کا طواف کرتے رہے۔

مادھو لال کے لئے بھی یہ عجب تجربہ تھا اور اس کے خاندان کے لیے بھی، مادھو نے

ابتدا میں شاہ حسین کی طرف کوئی توجہ نہیں دی مگر آخر میں وہ بھی بعض باتوں سے متاثر ہو کر شاہ حسین کی طرف مائل ہوا۔ شاہ حسین رات کے وقت مادھو کے گھر کا طواف کیا کرتے تھے اور مادھو اپنے گھر والوں سے جو باتیں کرتا تھا، شاہ حسین بیرون خانہ وہی باتیں باآواز بلند دہرا دیا کرتے تھے، مادھولال کے لیے یہ تعجب کی بات تھی کہ یہ رند دلوں کا حال جانتا ہے اور اپنے لبوں پر لے آتا ہے۔ حقیقت الفقراء کے مطابق

الغرض با حسین شد مادھو   از رہِ صدق یک دل و یک رو

در رہِ یک دلی بساز آمد   ناز او سر بسر نیاز آمد

مادھو شاہ حسین کا گرویدہ ہو گیا اور ان کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ مادھو نے شاہ حسین سے اپنی وابستگی کو اپنے گھر والوں سے چھپائے رکھا۔ مگر یہ تعلق چھپ تو نہیں سکتا۔ دو برس اسی صورت گزر گئے۔ مادھو بھی اسی رنگ میں رنگا گیا جس میں شاہ حسین رنگے ہوئے تھے۔ نور احمد چشتی کہتے ہیں "پھر تو وہ (مادھو) ہمیشہ شب و روز حضرت (شاہ حسین) کی خدمت میں حاضر رہنے لگا بلکہ جب تک حضرت کی زیارت نہ کر لیتا تو صبر و قرار اس کو نہ آتا تھا اور ہمیشہ حضرت کے ساتھ شریک بادہ نوشی ہوتا اور وہیں اٹھتا اور سوتا۔"

مادھو کے شاہ حسین سے اس تعلق میں وہ سارے معنی ڈال دیئے گئے جو ڈالے جا سکتے تھے اس طرح مادھو کے برہمن خاندان کو ہر طرف سے طعنے ملنے لگے، اس باعزت خاندان کے لیے جینا مشکل ہو گیا اور آخر کار انہوں نے طے کیا کہ اگر لوگوں کی زبان پر آئے ہوئے لفظ صحیح ہیں تو پھر شاہ حسین کو قتل کر دیا جائے۔ مادھو کے عزیز ہم مشورہ ہو کر دونوں کی تلاش میں رہتے، جہاں کہیں حسین اور مادھو شب بسری کرتے یہ ان تک پہنچنے کی کوشش کرتے اور ایسے موقعہ کی تلاش میں رہتے جب یہ دونوں ہم بستر ہوں۔ اوّل ان لوگوں کو ایسا موقع ہی نہ ملتا اور جب کبھی موقع ملتا انہیں اس مکان کا دروازہ ہی نہ ملتا اور نہ کوئی ایسی سبیل ملتی کہ وہ اس گھر کے اندر جا سکیں۔ بار بار کی ناکامی کے باوجود انہوں نے اپنا ارادہ ترک نہیں کیا مگر حسین کی

صحبت مادھو پر اپنا اثر کر گئی اور مادھو جو اپنے خاندان سے لاتعلق ہو چکا تھا اپنے مذہب سے بھی آزاد ہو گیا اس نے اسلام قبول کر لیا مگر اب بھی اس حقیقت کو زیادہ عیاں نہیں ہونے دیا گیا۔

مادھو کے اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے خاندان سے اور خاندان نے اس سے قطع تعلق کر لیا۔ اب مادھو ہمہ وقت شاہ حسین کی صحبت میں رہنے لگا لیکن انہی دنوں بیساکھ کا تہوار آ گیا مادھو کے رشتہ دار حسب رواج گنگا پر اشنان کے لئے چلے گئے۔ ماضی میں شاید مادھو بھی ان کے ہمراہ جایا کرتا تھا، پھر ان رسومات سے جذباتی تعلق بھی کم تو ہوا ہو گا مگر ٹوٹا ہرگز نہ تھا۔ جب مادھو کے ماں باپ بنارس کو چلے گئے تو مادھو کے دل کے اندر بھی وہاں جانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس خواہش کا اظہار اس نے شاہ حسین سے کیا، ہر چند شاہ حسین نے مادھو سے کہا کہ اب گنگا اشنان سے اس کا کوئی تعلق نہیں اس کے باوجود مادھو نے اصرار کیا اور سفر کے لیے اذن چاہا اس پر شاہ حسین نے کہا کہ اگر اسے گنگا میں اشنان کرنا ہی ہے تو پھر یہ اشنان لاہور میں رہتے ہوئے بھی ہو سکتا ہے۔ مادھو کو تعجب ضرور ہوا کہ اتنی دور کا سفر وہ کم وقت میں کیسے کر سکے گا، اگر وہ اس وقت سفر شروع کرے تبھی گنگا مائی تک پہنچ سکتا ہے مگر اس کا اپنے مرشد شاہ حسین پر ایک طرح کا ایمان تھا، اس لئے وہ خاموش رہا۔ گنگا میں اشنان کا روز آ پہنچا، مادھو دل ہی دل میں بڑا پریشان تھا کہ مرشد اس کو کس طرح گنگا میں غسل کرائے گا۔

مادھو نے حسین کے ارشاد کے مطابق اس روز اپنے مرشد کو وعدہ یاد دلایا۔ حسین نے اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے مادھو سے کہا کہ وہ آنکھیں بند کرے اور اپنا پاؤں حسین کے پاؤں پر رکھ دے۔ مادھو نے ایسا ہی کیا اور جب ایک لمحے کے توقف کے بعد حسین نے کہا کہ آنکھیں کھول دے تو مادھو نے آنکھیں کھول دیں نہ حسین تھے، نہ لاہور، سامنے دریائے گنگا بہہ رہا تھا، اس کے والدین اور دوسرے عزیز واقارب غسل کر رہے تھے، انہوں نے مادھو کو دیکھا اور مادھو نے ان کو، دونوں حیرت زدہ تھے۔ مادھو نے اشنان کیا اور پھر حسین کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق لاہور پہنچ گیا۔ مادھو حیرت زدہ تھا، اس نے

حسین سے سوال کیا کہ یہ کیسے ہوا، میں گنگا پر پہنچا اپنے عزیزوں کو دیکھا ان سے ملا اور پھر چشم زدن میں واپس بھی آگیا۔ حسین نے کہا "یہ رازِ ربانی ہے اس کا بیان کرنا مناسب نہیں"؟

اس واقعہ کے بعد مادھو نے ماں باپ، بیوی بیٹے اور پورے قبیلے سے قطع تعلق کر لیا اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان عام کیا۔

کرد روئے ہمہ بسوئے حسین — خاک شد از یقیں بکوئے حسین
پدر و مادر ہمہ زن و فرزند — خویش و قوم و قبیلۂ پیوند
ہمہ را ترک دادہ در پئے او — گشت مست محبت از مئے او

اس تعلق اور ترک مذہب کے باوجود حسین نے مادھو کو ایک حد تک اپنی پرانی رسومات کے ادا کرنے میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔ بسنت، پنچی اور ہولی کی تقریبات میں مادھو مرشد پر رنگ ڈال دیتا۔ تقریب کو رقص و سرود اور سرمستی میں گزارا جاتا۔ اور حسین کے دوسرے ساتھی بھی مادھو کی خاطر اس خوشی میں باقاعدگی سے شریک رہتے، حسین آخری دم تک ہر سال باقاعدگی سے یہ تہوار منایا کرتے تھے اور بعد میں ان کے مزار پر بھی یہ دن بڑے اہتمام سے منایا جاتا رہا۔

حسین کی عمر اب ساٹھ سال کے لگ بھگ ہو رہی تھی، مادھو کو انہوں نے جس قدر تعلیم اور تربیت دینا تھی دی مگر تصوف کی روایت کے مطابق وہ جو توجہ دے کر کسی کو صاحب حال بنایا جاتا ہے اس کا مرحلہ نہیں آیا تھا، چنانچہ ایک روز حسین نے مادھو سے کہا کہ شہر سے دور موضع بابو پورہ (اب باغبانپورہ) میں اپنے دوست بابو ڈھڈی یا ڈانڈا کے پاس چلیں گے وہ اس گاؤں کا رئیس تھا، اس سے ایک خالی مکان لیں گے جہاں بیٹھ کر شراب پئیں گے۔ مادھو مرشد کے اس حکم سے بہت گھبرایا۔ اس نے کہا کہ اس طرح تنہا دن بسر کرنے میں لوگ طرح طرح کے شک و شبہ میں گرفتار ہوں گے، میری بدنامی ہو گی اس لیے ایسا نہ کیا جائے۔ حسین نے مادھو کو بدنامی کے گزرے زمانے یاد دلائے اور کہا کہ بدنامی کے بعد جو زمانہ آیا ہے وہ کس انداز کا ہے اور

پھر یہ کہ حسین کے بارے میں اب کون الزام تراشی کر سکتا ہے۔ مادھو کے دل میں بھی اپنے مرشد کی پوری زندگی محفوظ تھی کہ کون کون سے کوئے ملامت سے ان کا گزر نہیں ہوا اور اب جو وہ یہ اہتمام کر رہے ہیں تو خدا جانے کیا مقصود ہے چنانچہ مادھو نے مرشد کے حکم پر سر تسلیم خم کر دیا۔

حسین اور مادھو کو بابو پورہ کے رئیس بابو ڈھڈی نے ایک خالی مکان دے دیا۔ اس میں حسین اور مادھو نے اپنی مجلس جمائی۔ رازو نیاز کی یہ مجلس مرشد اور مرید کے وصال کی مجلس تھی کہ اس میں حسین نے مادھو کو وہ درجہ دینا تھا جس کی خاطر اسے اپنا گرویدہ کیا تھا ان رسومات میں شراب نوشی اور بوسہ گیری بھی شامل تھی۔ حسین کے دوست بابو نے عام انسانی تجسس کے مطابق معلوم کرنا چاہا کہ یہ عمر رسیدہ مرشد اور نوجوان مرید کیا کر رہے ہیں، وہ خود چل کر اس مکان تک آیا، اسے شاہ حسین نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کسی کو اس مکان کی طرف آنے نہ دیا جائے مگر اور کوئی نہ آیا خود بابو تماشہ کرنے چلا آیا۔ حسین اور مادھو جس کمرے میں تھے اس کے دروازے میں ایک ایسا سوراخ تھا جہاں سے یہ دیکھا جا سکتا تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ بابو نے دیکھا حسین اور مادھو شراب پی رہے ہیں اور ایک دوسرے کو چوم بھی رہے ہیں۔ بابو سے یہ منظر دیکھا نہ گیا، اس کے دل میں شک نے راہ پالی اور ہر چند وہ حسین کی عظمت اور پاکیزگی کا قائل تھا ڈول گیا۔ اور واپس اپنے دوستوں کی محفل میں آ کر حسین اور مادھو کو جس حال میں دیکھا تھا بیان کیا اور پھر شک کا اظہار کرنے لگا، اس کے دوستوں میں ایک کا نام غالب جنگ تھا، غالب جنگ نے بابو کو اسی وقت سخت سرزنش کی اور کہا کہ یاروں کا حال چوری چوری دیکھنا گناہ ہے اسے سرِ عام بیان کرنا اخلاق اور دوستی کے تقاضوں کے خلاف ہے اور پھر یہ کہ بابو سمجھ ہی نہیں سکا کہ مرشد اور مرید میں اصل معاملہ کیا ہو رہا ہے۔ غالب جنگ نے بابو سے کہا!

مکن ایں راز با ہر کس فاش | دم مزن زینہار خامش باش
سرِ مردانِ حق مگو بکسے | پیشِ کس زیں سخن مزن نفسے
ہر چہ دیدی مگر بہ حرص و ہوا | سرِ ناگفتنی ست سرِ خدا

غالب جنگ نے بابو کو سمجھایا کہ حسین رازِ درون پردہ سے مادھو کو آشنا کر رہے تھے جو بابو کی سمجھ میں نہیں آسکتا، بظاہر دنیا کی نظر میں اس کا جو مفہوم ہے بابو کو وہ مفہوم نہیں لینا چاہیئے، بابو اور حاضرین کچھ قائل بھی ہوئے مگر دل کے اندر ایک وہم سا موجود رہا۔ اس پر غالب جنگ نے بابو سے کہا کہ اب وہ پھر جاکر دیکھے کہ حسین اور مادھو کیا کر رہے ہیں۔ بابو پھر اس خالی مکان کی طرف گیا، اس نے اسی سوراخ سے اندر دیکھا تو وہاں حسین اور مادھو کی بجائے دو شیر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے پر مرکوز تھیں۔ بابو دہشت زدہ ہو کر بھاگا۔ یاروں کی مجلس میں آکر بے ہوش ہو گیا اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے سب کے سامنے ندامت کا اظہار کیا کہ اس نے ان دو خدا رسیدہ بزرگوں کے بارے میں گستاخی کی تھی جس کی وہ سب سے معافی مانگتا ہے۔

شاہ حسین نے مادھو کو جس مرتبہ پر پہنچا دیا تھا اس کے بارے میں اسی جگہ ہدایت کی کہ اسے اس راز کو عام نہیں کرنا، نہ ہی فقیروں والا لباس پہننا ہے، نہ ان کے طریق اپنانے ہیں، فی الحال اسے ایک دنیادار آدمی کی حیثیت سے زندگی گزارنی ہے اور رزق کمانے کے لئے اگر نوکری بھی کرنی پڑے تو ملازمت اختیار کر لینی ہے۔

ظاہرش در لباسِ دنیادار	باطنش در اساسِ فقر بکار
کز تحصیل سازِ ما یحتاج	نشود ہم چوں سائلاں محتاج
بہر خوردن اگر بجوید نان	جوید از چاکری سبب بجہاں
نہ نشیند بگوشہ چوں فقرا	در سفر جستجو کند خود را

شاہ حسین نے کہا کہ اسے اڑتیس برس سے پہلے فقر و غنا کی طرف رخ نہیں کرنا چاہیئے۔ میری یعنی شاہ حسین کی موت کے تیرہ برس بعد (۱۰۲۱ھ) اسے نوکری چھوڑ کر مزار پر آجانا چاہیئے اس وقت مادھو کی عمر اڑتیس برس ہو جائے گی۔

حسین نے بابو پورہ محلہ کے اس خاص مکان میں مادھو لال سے تنہائی میں جو گفتگو کی

اس کو محمد پیر نے یوں بیان کیا ہے ۔

ظاہرش در لباس دنیا دار   باطنش در اساس فقر بکار
کر تحصیل سازِ ما یحتاج   نشود ہم چوں سائلاں محتاج
بہر خوردن اگر بجوید نان   جوید از چاکری سبب بجہان
پیشۂ چاکری بگیرد پیش   کند از رفع پیشہ حاجت خویش
ننشیند بگوشہ چوں فقرا   در سفر جستجو کند خود را
کشد ایں گونہ پئے ہمہ آزار   سیزدہ سال بعد مرگم کار
عمر در سی و ہشت تا بکند   روئے در فقر و در فنا بکند
پیشۂ چاکری گذارد و باز   باشد از فقر با خدا دم ساز
معتکف بر مزار من گردد   میرد و ہم کنارِ من گردد
چوں شنید از حسین این گفتار   ہم چنیں کرد مادھوا ناچار

حسین نے مادھو کو ایک دنیا دار کی طرح زندہ رہنے، خود کام یا نوکری کرکے کمانے فقیروں کی طرح گدائی کرنے، گوشہ گیر ہونے کی بجائے سفر کرنے اور حقیقت کی اپنے طور پر جستجو کرنے اور اپنی موت کے بعد فقیری کی طرف آنے کی ہدایت کی۔ گویا بابو پورہ کے اس تنہا مکان میں حسین نے مادھولال کے مستقبل کے کیریئر کی منصوبہ بندی کی اور ہر چند مادھولال کو حسین سے فراق اور ہجر منظور نہ تھا مگر مرشد کے کہنے کے مطابق ہی اسے یہی اختیار کرنا پڑا۔

محمد پیر کے مطابق مادھولال اکبری فوج میں بھرتی ہوگیا اور بہار اور بنگال میں متعین راجہ مان سنگھ کے دستوں سے وابستہ ہوا۔ راجہ مان سنگھ نے بہار کے علاوہ اڑیسہ کی طرف بھی توجہ دی اور مقامی حکمرانوں کو شکست دے کر اپنی برتری قائم کرلی۔ اڑیسہ سے ملحق دکن کے علاقوں میں خود مختار بادشاہوں کا راج تھا۔ دوسرے یورپی تاجروں نے سمندر کے ساتھ ساتھ اپنے راستے بنا لیے تھے اور وہ بوقت ضرورت مقامی حالات میں دخل دیتے تھے۔

شاہ حسین نے غیر ملکیوں یا فرنگیوں کی طرف سے ہندوستانی سمندروں میں اپنی برتری قائم کر کے مقامی حالات میں مداخلت کے حوالے سے اکبر کے صرف دو امیروں کی مختلف انداز میں حمایت کی۔ ان میں ایک راجہ مان سنگھ ہے جس کی فوج میں مادھولال شامل ہوا اور دوسرا مرزا عبدالرحیم خان خاناں جسے سندھ کے حکمران مرزا جانی بیگ کو راہ راست پر لانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ خان خاناں نے ابوالفضل کو ساتھ لے کر خود شاہ حسین کے پاس حاضری دی، جب کہ راجہ مان سنگھ کو مادھولال دیا گیا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ شاہ حسین نے کچھ اپنی متنازعہ شخصیت اور طریق زندگی کے باعث حاکموں کے قہر سے بچنے کی کوشش اسی انداز میں کی ہو کہ مادھولال کی خدمات حکمرانوں کے سپرد کر دیں۔ دوسرے دین الٰہی کی جس انداز میں یلغار ہوئی تھی شاہ حسین نے اس کی چڑھائی کو دیکھ کر بچاؤ کا یہ راستہ دیکھا ہو کیونکہ اگر حسین کو مذہب کے روایتی طریق کار سے اس قدر اختلاف تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے دین الٰہی سے اس سے بھی زیادہ مخاصمت ہو۔

مادھو کو لاہور سے باہر بھیجنے کی ایک اور مصلحت بھی ہو سکتی ہے اور وہ شاہ حسین کا پیر بھائی ارزانی ہو سکتا ہے۔ شیخ ارزانی بہلول شیخ کا مرید تھا اگر وہ شاہ حسین کی عظمت اور مقبولیت سے ایک طرح کا حسد کرنے لگا تھا۔ محمد پیر نے شیخ ارزانی کے دو واقعے لکھے ہیں۔ ایک شاہ حسین کی زندگی کے دوران کا اور دوسرا ان کے مرنے کے بعد کا۔۔۔۔ ان دو واقعات سے نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اولاً وہ شاہ حسین پر اپنی عظمت اور برگزیدگی ثابت کرنا چاہتا تھا اور اس کوشش میں بُری طرح ناکام ہوا۔ دوسرے وہ نہیں چاہتا تھا کہ لاہور چھوڑ کر بیٹھ جائے اور اس کی خواہش ایسی تھی کہ وہ شاہ حسین کا گدی نشین بن جائے۔ شاہ حسین اس مقصد کے لیے غالباً مادھولال کو منتخب کر چکے تھے مگر نہیں چاہتے تھے کہ اس حوالے سے شیخ ارزانی سے کوئی تنازعہ شروع ہو جائے اس لئے انہوں نے مادھولال کو بابو پورہ میں ساری صورتِ حال سے آشنا کر دیا ہو گا کہ اگر مادھو اس عرصے میں نہ صرف ان کی قربت سے

محروم کر دیا جائے بلکہ اسے لاہور سے ہزاروں میل دور بھیج دیا جائے تو شیخ ارزانی یا کوئی دوسرا اس گدی نشینی کی دوڑ میں فتنہ و فساد پیدا نہیں کرے گا۔

عقلی اعتبار سے یہی وجوہات مادھولال کی فوج میں بھرتی کے سلسلے میں موزوں نظر آتی ہیں مگر شاہ حسین کی زندگی کے اس دور کی ان باتوں کے اسباب و علل کیا تھے ان کے بارے میں قیاس آرائی لایعنی ہو گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رہ گیا راجہ مان سنگھ کے ساتھ مادھولال کو بھیجنے کا معاملہ تو مان سنگھ کے بارے میں مآثر الامرا میں سے ایک آدھ واقعہ بیان کیا جانا ضروری ہے لکھا ہے :

"کہتے ہیں ایک روز ایک سید نے ایک براہمن سے دین ہنود پر اسلام کی فوقیت کے سلسلے میں گفتگو کی اور راجہ کو ثالث مقرر کیا۔ راجہ نے کہا کہ اگر میں اسلام کو بہتر بتاؤں گا تو لوگ کہیں گے کہ بادشاہِ وقت کی خوشامد میں ایسا کہتا ہے اور اگر اس کے خلاف کہتا ہوں تو جانب داری پر محمول کیا جائے گا۔ جب ان لوگوں نے اصرار کیا تو راجہ نے کہا کہ میں عالم نہیں ہوں لیکن ہندوؤں کے مذہب میں جو اتنے قدیم زمانے سے چلا آتا ہے اگر کوئی کتنا ہی مذہبی اعتبار سے صاحب کمال ہو جیسے ہی مرتا ہے لوگ اس کو جلا دیتے ہیں اور ہوا میں اڑا دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص رات کے وقت وہاں جائے تو جنات کا خوف ہوتا ہے اور اسلام میں ہر قصبہ و شہر میں ایسے بزرگوں کے مزار ہیں کہ جن کی زیارت کی جاتی ہے اور ان سے برکت ہوتی ہے اور طرح طرح کی مجالس منعقد کی جاتی ہیں۔"

"کہتے ہیں کہ بنگالہ جاتے وقت (راجہ مان سنگھ) مونگیر میں شاہ دولت قاضی کی خدمت میں پہنچا کہ جو اس وقت صاحب کمال لوگوں میں سے تھے۔ شاہ دولت نے فرمایا اس عقل و دانش کے باوجود مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا؟ راجہ نے عرض کیا قرآن شریف میں آیا ہے۔ "ختم اللہ علی قلوبھم" اگر آپ کی توجہ سے شقاوت کا قفل میرے سینے سے ہٹ جائے تو فوراً مسلمان ہو جاؤں ایک مہینے تک اسی امید میں ٹھہرا رہا مگر اس کی قسمت میں اسلام نہ تھا۔"

راجہ مان سنگھ کا مسلمانوں سے علاقہ دوسری طرح بھی تھا کہ اس کی بہن شہزادہ سلیم

سے بیاہی ہوئی تھی۔

محمد پیر کے کہنے کے مطابق مادھولال راجہ مان سنگھ کی فوج میں بھرتی ہو کر دکن کی طرف چلا گیا۔ راجہ مان سنگھ کو اکبر کے چونتیسویں سالِ جلوس یعنی ۹۹۷ھ (۸۹-۱۵۸۸ء) میں کابل سے بلا کر بہار بھیجا گیا تھا جبکہ شاہ حسین کی مادھو سے ملاقات ۱۰۰۱ھ میں ہوئی تھی۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جب مان سنگھ اڑیسہ اور دکن کے ملحقہ علاقوں کو زیر کرنے میں مصروف تھا اس وقت اسے لاہور سے جو فوجی کمک بھیجی گئی ہو گی اس میں مادھولال بھی شامل ہو گا اور یہ واقعہ بہر طور شاہ حسین کی زندگی کا ہی ہے۔

"حقیقت الفقراء میں لکھا ہے کہ جب راجہ مان سنگھ کو بنگال بھیجا گیا تو پھر مادھولال بھی اس کے ساتھ گیا اور جب اکبر بادشاہ نے راجہ مان سنگھ کو دکن کی طرف توجہ دینے کے لئے کہا تو بہار کے قریب ایک زبردست معرکہ ہوا جس میں دکن کی فوجوں کی سربراہی معروف حبشی جرنل ملک عنبر کر رہا تھا۔ دکنیوں نے کچھ اس طرح سے جنگ کا آغاز کیا کہ راجہ مان سنگھ کی فوجوں کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ محمد پیر لکھتا ہے۔

زاں طرف درمیان فوج عدو	بود سردار ملک عنبر جو،
زیں طرف راجہ بود کار گذار	درمیان سپہ سپہ سالار
پس بہم جمع گشتہ دکنیاں	چست بستند بہر جنگ میاں
شیشۂ صلح را بجنگ زدند	از پئے جنگ طبلِ جنگ زدند
بسکہ اہلِ دکن شدند مصر	پیش بردند کار خود آخر
لشکر راجہ را عبراں میداں	ہیچ دیگر نماند تاب و تواں
کہ دگر بار دست بر دارند	حملہ در جنگ دشمناں آرند
بستہ شد دستِ شاں زجنگ عدو	مے ندیدند اماں زجنگ عدو

راجہ مان سنگھ اس پریشانی کی حالت میں تھا کہ اس کی نظر مادھولال پر پڑ گئی، راجہ نہیں جانتا

تھا کہ یہ شخص لاہور سے ہے اور شاہ حسین کا مرید خاص ہے۔ لیکن مادھو کی وضع قطع سے راجہ نے قیافہ لگایا کہ شاید یہ سپاہی کچھ اور قسم کا ہے۔ راجہ نے جس انداز میں مادھو کو دیکھا اس کے جواب میں مادھو مسکرادیا۔ گفت غم نیست۔۔۔۔۔

اس کے بعد مادھو نے خُدا سے دعا کی "فتح راجہ کو نصیب ہو"۔ مادھو نے اس سمے اپنے دلبھا شاہ حسین کو یاد کیا جو اس وقت لاہور میں اپنے دوستوں کے ساتھ محفل جما کر بیٹھے تھے۔ شاہ حسین ایک دم بے قرار ہو گئے اور دوستوں سے کہنے لگے کہ میں تو جا رہا ہوں مگر تم میں سے کوئی بھی میرے آنے تک یہاں سے نہیں جائے گا۔ مجھے مادھو نے یاد کیا ہے میں اس سے مل کر ابھی واپس پہنچتا ہوں اس لیے یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہنا چاہیئے۔

ساقی و مطرب و صراحی و جام　　　مجلس دوستان و عیش تمام

یہ کہہ کر حسین اس گھر سے باہر نکلے اور پل کی پل میں میدان جنگ میں مادھو کے پاس پہنچ گئے مادھو سے کہا کہ راجہ سے کہو یہ جنگی تدبیر آزمائے۔ مادھو نے راجہ سے وہی کچھ کہہ دیا اور یہ بھی کہ ہوا میں دیکھو ایک لشکر مدد کے لئے آیا ہے۔ راجہ نے نگاہ ڈالی تو اسے کمک پہنچ چکی تھی اور اسی لمحے میدان جنگ میں فیصلہ ہو گیا۔ ہارتا ہوا راجہ جیت چکا تھا۔ دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔

شاہ حسین اور مادھو دو گھڑی مل کر بیٹھے۔ راز و نیاز کی باتیں ہوئیں اور پھر شاہ حسین نے مادھو کو بتایا کہ دوست لاہور میں مجلس جما کر بیٹھے ہیں، میرا انتظار ہو رہا ہو گا اس لئے میں لاہور چلتا ہوں اور جب وہ لاہور پہنچے:

دوستانش بخانہ او باہم　　　بنشستہ بیاد او خرم
در رہش انتظار مے بردند　　　بادہ بے صحبتش نمے خوردند
دوستاں راز او چو بشنیدند　　　ایستادہ شدند و رقصیدند
از غم روزگار کرد وداع　　　ہمہ برپا شدند بہر سماع

نازِ بر روزگار خود کردند　　شکرِ پروردگارِ خود کردند

کہتے ہیں کہ جب جنگ ختم ہوئی تو راجہ، مادھولال کے پاس آیا، اپنا سر مادھو کے قدموں پر رکھ دیا اور کہا کہ مادھو تو درویش ہے مجھے علم نہ تھا کہ تو اتنا کامل ہے اور تیرا خدا سے اتنا قریبی تعلق ہے۔ اس لئے اب نہ میں آقا ہوں، نہ تم نوکر ہو بلکہ تو پیر ہے اور میں مرید ہوں۔ تو مجھے جو حکم دے گا میں پورا کروں گا۔ مادھو نے کہا کہ اللہ کو یوں ہی منظور تھا، یہ سب اللہ کا کرم ہے، ورنہ ہماری کیا حیثیت ہے۔ بہر طور تم میرے راز سے آگاہ ہو چکے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے واپس لاہور جانے کی اجازت دو تاکہ میں اپنے مرشد حسین کے قدموں میں زندگی گزار سکوں۔ مجھے حسین نے ملازمت کا حکم دیا تھا ورنہ ہم فقیروں کا ملازمت سے کیا تعلق۔

راجہ مان سنگھ نے اسی وقت مادھولال کو لاہور جانے کی اجازت دی اور مادھو منزلیں مارتا لاہور میں حسین کی خدمت میں پہنچ گیا۔

بود در پیش او بصدقِ تمام　　مخلص و خادم و مرید و غلام

بود ہر روز و شب بخدمت او　　دم نزد بجز ارادتِ او

چند سال بعد حسین کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وصیت کے مطابق انہیں مادھو ہی کے گاؤں شاہدرہ میں دفن کیا گیا۔ بظاہر مادھو اور شاہ حسین کا تعلق صرف سات برس کا ہے مگر دونوں میں اس قدر شدید ربط باہم تھا کہ مادھو کے لیے یہ صدمہ برداشت کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ شب و روز گریہ زاری میں گزرتے۔ مادھو کی یہ حالت پورے ایک سال رہی اور ساتھیوں کو یہ خدشہ تھا کہ اگر معاملہ یونہی رہا تو مادھو کے بچنے کی امید کوئی نہیں لیکن وہ بھی مادھو کو شاہ حسین کی قبر سے جدا نہیں کر سکتے تھے۔ پھر شاہ حسین ایک رات مادھو کو خواب میں دکھائی دیئے انہوں نے اس کی دلجوئی کی اور ہدایت دی کہ وہ پھر راجہ مان سنگھ کے پاس چلا جائے اور وصیت کے مطابق وہاں بارہ برس گزارے۔

مادھو نے مرشد کے حکم پر "آمنّا صدقنا" کہا اور دکن کی طرف چل نکلا، بارہ برس کسی نہ کسی حالت

میں گزارے۔ ۱۰۲۱ھ میں واپس لاہور آیا۔ اس اثنا میں حسین کی نعش کو شاہدرہ سے باغبانپورہ (داغبانپورہ) میں موجودہ جگہ پر منتقل کیا جا چکا تھا۔

جس روز مادھو شاہ حسین کے مزار پر آیا۔ نو مسلم جوگی نے جس کا نام خاکی دیوان رکھا گیا تھا وہ امانت جو جوگیوں سے تنازعہ کے بعد زمین سے برآمد ہوئی تھی (تسبیح، مصلا، قرآن شریف اور سرخ پگڑی) اس میں سے سرخ پگڑی مادھو کے سپرد کی اور نور احمد چشتی کی تحریر کے مطابق "آپ زندہ زمین میں سما گئے۔ چنانچہ اب تک مثل مشہور ہے کہ مادھو آیا اور خاکی سمایا"۔۔

مادھو کی عمر اب اڑتیس برس ہو چکی تھی اور شاہ حسین کی ہدایت کے مطابق اڑتیسویں برس میں مادھو نے اپنی ولایت کا اظہار کیا۔۔۔ مادھو شاہ حسین کے سولہ خلفاؤں میں سرفہرست تھا ان میں چار کے ناموں کے ساتھ شاہ غریب، چار کے ساتھ خاکی، چار کے ساتھ دیوان اور چار کے ساتھ بلاول کا لفظ آتا ہے۔ مادھو پہلے دیوان تھے انہوں نے پینتیس برس شاہ حسین کے مزار پر گزارے اور ۲۲ ذی الحج ۱۰۵۶ھ کو تہتر برس کی عمر میں انتقال کیا۔ انہیں شاہ حسین کے پہلو میں دفن کیا گیا جس سے زندگی میں صرف سات برس کا تعلق صدیوں پر محیط ہو گیا۔ اور بقول شاہ حسین

اچھل ندیاں تارو ہو ئیاں وچ بریتا کیہا

سیل آب سے ندیاں کناروں سے باہر اچھل پڑیں اب درمیان میں بریتا کہاں رہ گیا۔

مُلّا عبدالحکیم سیالکوٹی کو مرید نہیں کیا

دارا شکوہ نے حسنات العارفین میں شاہ حسین کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ذریعہ معلومات کے سلسلے میں کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا۔ زیادہ تر سنی سنائی باتوں کا مذکور ہے۔ دارا شکوہ بہرحال شاہ حسین کے عہد کے بہت قریب کا راوی ہے، دوسرے حکمران خاندان کا چشم و چراغ ہے تیسرے حسین سے اکبر، جہانگیر اور بیگمات کی عقیدت کا بھی ذکر کرتا ہے اس لیے اسے معتبر راوی سمجھا جائے گا۔۔۔ لیکن دارا شکوہ نے اپنا بیان مزید معتبر بنانے کے لیے دو ایسے گواہ بھی ساتھ رکھے ہیں، جنہوں نے شاہ حسین کو دیکھا بھی ہے اور جب وہ خود کتاب لکھ رہا تھا اس وقت وہ زندہ بھی تھے۔ اس زاویہ سے دیکھا جائے تو وہ کسی کا کوئی ایسا بیان نہیں لکھ سکتا جس سے بیان دینے والا ہی انکاری ہو جائے۔ ان گواہوں میں سے ایک طبیب سرہندی ہیں اور دوسرے معروف عالم اور استاد علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی۔

دارا شکوہ دونوں گواہوں کی زبانی "حسنات العارفین" میں بیان کرتا ہے: "شیخ طبیب نے اسے (حسین) دیکھا اور اس کے اقوالِ عالی ان کو یاد تھے۔ کہتے تھے جو اس کے پاس جاتا تھا اس سے سب سے پہلے یہ کہتا تھا کہ داڑھی مُنڈا، اس کے بعد پیالہ اس کے ہاتھ میں دیتا

تھا۔ اگر قبول کرتا تو اس کو اپنا مرید بناتا نہیں تو پاس سے نکال دیتا تھا"؟

مُلّا عبدالحکیم نے کہا کہ میں اس کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے مرید کر۔ کہا مجھ کو شہر میں رسوا کرنا چاہتا ہے۔ تو مُلّا آدمی ہے اس کام کا نہیں۔

مُلّا عبدالحکیم سیالکوٹی کے بارے میں مراۃ العالم میں درج ہے کہ وہ ۹۸۸ھ میں پیدا ہوئے یعنی شیخ حسین کی وفات کے وقت مولانا سیالکوٹی کی عمر بیس سال تھی وہ مادھولال سے بھی پانچ برس چھوٹے تھے۔ محمد صالح کنبوہ "شاہجہان نامہ" میں مولانا کے بارے میں لکھتا ہے "دارالسلطنت لاہور کے مضافات کا قصبہ سیالکوٹ ان کی ولادت ہے۔ علم و فضل کے سبب انہیں اتنی شہرت حاصل ہے کہ تعارف کی حاجت نہیں اگر ان کو بو علی سینا اور ابو نصر فارابی کا ہمسر ٹھہرائیے تو بجا ہے اور عقول عشرہ کی صف میں جگہ دیجئے تو زیبا۔ آغاز عمر میں ہی مبداءِ فیاض کی عنایت سے تمام علوم و فنون کے حاوی ہو گئے۔ خداداد کمالات اور ذکاوت و ذہانت کے سبب علمائے قدیم کی تمام کتابوں پر حواشی لکھے۔۔۔۔ ساٹھ سال تک درس و تدریس کر کے شریعت اسلامی کے فرائض، سنتوں اور مسائل کی تلقین کرتے رہے۔ رسول اکرم ؐ کے دین کی تعلیم اور اپنی ذاتِ حمیدہ صفات کی برکت سے پنجاب بلکہ سارے ہندوستان کو فیض پہنچایا۔ رفتہ رفتہ ان کے علم کا درجہ یہاں تک پہنچا کہ بڑے بڑے عالم فاضل ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے اور باکمال ادیب طفلانِ مکتب کی طرح صف بستہ ہوتے۔ ہر شخص اعتراف کرتا کہ خطۂ یونان کا حکیم کامل ارسطو ان کے سامنے ابجد خواں ہے الغرض اس مالک فضائل و کمالات سے تمام فاضلانِ زمانہ نے استفادہ کیا۔ ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۷ء) میں جہانِ فانی سے رحلت کی۔

(داراشکوہ نے حسنات العارفین ۱۰۶۴ھ میں مکمل کی)

میاں اخلاق احمد" تذکرہ حضرت ایشاںؒ" میں لکھتے ہیں "مُلّا کمال الدین (وفات ۱۰۱۷ھ) کے نامور شاگرد تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہجہان کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خان (چنیوٹ کے) آپ کے ہم درس تھے۔ علم تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، معانی، منطق، فلسفہ اور علم کلام میں

اپنی مثال آپ تھے۔۔۔۔۔ شاہجہان اکثر دینی و سیاسی امور میں آپ سے مشورے کرتا تھا۔ آپ کی علمی قابلیت کا بڑا معترف تھا۔ آپ کو دو مرتبہ چاندی میں تلوایا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کو سب سے پہلے آپ نے ہی مجدد الف ثانی کے خطاب سے مخاطب فرمایا اور حضرت مجدد نے آپ کو "آفتاب پنجاب" کے لقب سے ملقب کیا۔ کتاب غنیۃ الطالبین جو حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی کی تصنیف ہے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں آپ نے حضرت شیخ بلاول قادری کے ایما سے کیا۔ حضرت شیخ محمد میر المعروف بہ میاں میرؒ سے بھی دوستانہ مراسم تھے اکثر آپ کی ملاقات کے لئے جایا کرتے تھے۔ تمام عمر لاہور میں درس و تدریس میں گزاری اور تمام علمائے ہند سے اپنی علمیت و فضیلت کا لوہا منوایا اور آپ کے لکھے فتاویٰ قبول کئے گئے۔ شاہ جہان کی اجازت سے لاہور میں درس جاری کیا اور مفت تعلیم دی۔ سیالکوٹ میں ایک مدرسہ اور اسلامی مرکز قائم کیا۔ اس میں نہ صرف پنجاب بلکہ بنگال، کشمیر، ایران، توران بلکہ عراق و مصر کے طلبہ منطق، فلسفہ، فقہ اور علم کلام کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے۔ حاشیہ شرح مواقف، تکملہ حاشیہ عبدالغفور۔ حاشیہ کتاب المشہود حاشیہ مقدمات تلویح، حاشیہ تفسیر بیضاوی، حاشیہ مطول، حاشیہ شریفیہ، حاشیہ شرح، عقائد تفتازانی، حاشیہ عقائد دوانیہ، حاشیہ شرح شمسیہ، حاشیہ شرح ہدایۃ الحکمۃ، حاشیہ خیالی حاشیہ قطبی، حاشیہ مراج الارواح اور حاشیہ مطالعہ آپ کی مشہور علمی یادگاریں ہیں۔ آپ کی تصانیف نہ صرف ہندوستان کی علمی درسگاہوں میں بلکہ مراکش و بخارا، کابل و قسطنطنیہ اور مصر و شام تک پڑھائی جاتی ہیں۔ ۱۸ ربیع الاول ۱۰۶۸ھ (محمد صالح کنبوہ کے مطابق ۱۲ ربیع الثانی) میں وفات پائی اور سیالکوٹ کے محلہ میانہ پورہ میں دفن ہیں۔ یہی آپ کا آبائی محلہ تھا اور غالباً آپ کے نام پر اس کا نام رکھا گیا۔ پنجاب میں استاد کو میاں کہا جاتا ہے جس سے اس کی شکل میاں پورہ سے میانہ پورہ ہو گئی۔

دارا شکوہ "حسنات العارفین" میں لکھتا ہے۔ "اور نیز ملا عبدالحکیم نے بیان کیا کہ میں اس (شاہ حسین) کے پاس بیٹھا تھا ایک شخص آیا اور کہا میں ایک عورت پہ عاشق ہوں اور وہ مجھ سے

راضی نہیں ہوتی۔ شیخ حسین نے کہا جا چند روز ایک مخصوص جگہ میں بیٹھ کر اس کا نام لیتا رہا۔ چند روز کے بعد اس شخص نے آکر کہا وہ عورت بے اختیار ہو کر میرے پاس آگئی ۔۔۔۔۔۔ اسی طرح ایک اور شخص اس کے پاس گیا اور کہا کہ میری ایک حاجت ہے اور وہ بر نہیں آتی۔ اس کو ایک گائے دی کہ جا کر اس پر پیشاب کر۔ اس نے جب ایسا کیا تو اس کی حاجت پوری ہو گئی ۔۔۔۔۔ اس قسم کی باتیں اس کی (شاہ حسین کی) بہت ہیں"۔۔۔۔

مُلا عبدالحکیم نے دارا شکوہ سے یہ باتیں اوائل عمر میں نہیں کیں۔ دارا شکوہ نے مُلا کی یہ باتیں ۱۰۶۲ھ میں لکھیں جبکہ مولانا حکیم اس وقت زندہ تھے۔ مُلا حکیم کی زبانی باتوں میں سے ایک بات بہت اہم ہے اور وہ ہے گائے پر پیشاب کرنے کی۔ گائے اہل ہنود کے لیے بڑا مقدس جانور تھا اور اب بھی ہے۔ اکبر کے عہد میں جب غیر معمولی رواداری کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا اور غالباً آدھا حرم غیر مسلم تھا اور دین الٰہی کو رائج ہوئے کئی برس ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں گائے کی ایسی بے حرمتی کا داؤ بتانا شاہ حسین جیسا شخص ہی کر سکتا تھا۔ بلاوجہ تقدیس شاہ حسین کو کبھی منظور نہیں رہی۔

دوسری بات یہ بھی توجہ طلب ہے کہ شاہ حسین نے اس شخص کو خود گائے دی۔ گائے بہر حال اس زمانے میں بھی قیمتی چیز ہوتی ہو گی۔ اس لیے ایسی قیمتی شے کسی کو دے دینا ظاہر کرتا ہے کہ حسین کی نذر میں قیمتی چیزیں ضرور آتی ہوں گی اور حسین یہ چیزیں روایت کے مطابق فی الفور ضرورت مندوں میں یا سائلوں میں تقسیم کر دیتے ہوں گے۔

عبدالرحیم خان خاناں

سندھ کا حکمران مرزا عیسیٰ ترخان اکبر بادشاہ سے ایک برس پہلے تخت نشین ہوا۔ اکبر کو سندھ سے اس لحاظ سے بھی جذباتی وابستگی تھی کہ وہ سندھ میں امرکوٹ (عمرکوٹ) میں پیدا ہوا۔ یہاں اس کا باپ بہت مارا مارا پھرا۔ کوئی اس کا حامی و مددگار نہ ہوا۔ بلکہ اس کے زادِ سفر تک کا محفوظ رہنا مشکل ہوا اور ایک مرحلے پر تو یہ خدشہ بھی لاحق ہو گیا کہ حرم شاہی ہی بے آبرو نہ ہو جائے۔ چنانچہ اکبر کے تخت نشین ہونے کے بعد لامحالہ اسے سندھ کی صورت حال سے ایک طرح کی دلچسپی ہونا خاصۂ فطرت کے عین مطابق تھا۔ سندھ سے اس کا دوسرا تعلق ایک دوسرے حوالے سے بن رہا تھا۔ یورپی تاجروں اور طالع آزماؤں نے ہندوستان کو سمندر کے تمام راستوں سے گھیر رکھا تھا اور یہ علاقے سندھ، گجرات، دکن، بہار اور بنگال کے مرکز سے دور کے علاقے تھے۔ مرزا عیسیٰ خان ترخان کا زمانہ تو خیریت سے گزر گیا۔ اکبر خود اپنے بھائیوں اور چچاؤں سے الجھا ہوا تھا، دہلی میں ہیمو بقال کا معرکہ بھی اسی زمانے میں اس نے سر کیا، پھر نوعمری کا زمانہ تھا۔

تاریخ طاہری کے مطابق مرزا عیسےٰ ترخان کی زندگی میں ہی اس کے دو بیٹے میرزا صالح اور میرزا باقی آپس میں الجھ پڑے۔ میرزا صالح انہی دنوں کہا کرتا تھا کہ جب جلال الدین اکبر بادشاہ اپنے مصاحبین کے ساتھ شکار سے لیے آئیں گے تو میں ان کے غلاموں کو یہاں لاؤں گا۔ میرزا صالح نے آخر کار باپ کو گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا اور بھائیوں کو جلا وطن کر دیا۔ میرزا باقی نے کچھ کے راجپوتوں کی مدد سے میرزا صالح سے زبردست ٹکر لی مگر ناکام ہو کر بکھر کے حاکم سلطان محمود خان کے پاس مدد کے لیے پہنچا۔ انہی دنوں میرزا صالح قتل ہو گیا۔ ۹۷۰ھ (۱۵۶۱ء) میں میرزا عیسےٰ ترخان نے پھر حکومت سنبھالی۔ میرزا باقی کو سلطان محمود خان سے واپس بلا لیا اور سیوستان بھیج دیا۔ اسی اثنا میں میرزا عیسےٰ ترخان اور میرزا باقی نے بکھر پر حملہ کر دیا۔ بکھر کے قلعے کا محاصرہ بھی نہیں ہوا تھا دونوں فوجیں آمنے سامنے نہیں آئی تھیں کہ دار الحکومت سے خبر ملی کہ فرنگی (پرتگیزی) لاہوری یا لاہری بندر کو عبور کر کے ٹھٹھہ پہنچ گئے ہیں۔ اس وقت تک شہر کے دروازے بند تھے، میرزا عیسےٰ اور میرزا باقی فوراً واپس پہنچے مگر اس عرصے میں پرتگیزی شہر میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے بعد واپس لوٹ گئے تھے اور جاتے جاتے شہر کو آگ بھی لگا گئے تھے۔ "تحفتہ الکرام" میں درج ہے کہ پرتگیزی میرزا عیسےٰ ترخان کی آمد کی خبر سُن کر شہر ٹھٹھے کو لوٹ کر اور گلی کوچوں میں بارود بچھا کر اور اس میں آگ لگا کر بھاگ گئے۔

"بیگلار نامہ" کے مطابق پرتگیزی خود نہیں آئے تھے بلکہ میرزا عیسےٰ نے خود ان کو اپنی مدد کے لئے بلایا تھا لیکن جب وہ آئے اور انہوں نے دیکھا کہ ملک کا والی شہر میں ہی نہیں تو انہوں نے لوٹ مار شروع کر دی اور جب وہ واپس آیا تو وہ بھاگ گئے۔ پرتگیزیوں کی یہ فوج تعداد میں سات آٹھ سو تھی اور اٹھائیس کشتیوں میں سوار ہو کر برتیو نامی کمانڈر کے زیر اہتمام ٹھٹھہ آئی تھی اور سمندر سے دریائے سندھ تک پہنچنے میں انہوں نے کمال چالاکی کا مظاہرہ کیا، خود کو تاجر بتایا اور کہا کہ وہ سامان دے کر اور سامان خرید کر واپس ہو جائیں گے۔

ڈینورس فریڈرک چارلس نے لکھا ہے کہ جب پرتگیزی فوج ٹھٹھ پہنچی اور میرزا عیسے کو نہ پایا تو اس کے شہزادے سے اپنی مہم کے اخراجات طلب کیے۔ شہزادے نے یہ اخراجات دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر برتیو اپنے آدمیوں کو لے کر ٹھٹھ میں داخل ہوا۔ اس نے آٹھ ہزار شہریوں کو قتل کیا۔ تقریباً بیس لاکھ کی چاندی کا بہترین سامان جلا دیا۔ بہت سا ساز و سامان کشتیوں میں بھر کر لے گیا۔ اتنا مال غنیمت شاید ہی کسی حملہ آور کو اس طرح ملا ہوگا۔ اس حملے میں اس کا ایک آدمی بھی ضائع نہیں ہوا وہ یہاں ایک ہفتہ تک رہا اور دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر جتنی آبادیاں تھیں ان کو لوٹ لیا۔

مختصر یہ کہ فرنگیوں نے اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا اور ثابت کر دیا کہ وہ ہندوستان اور اس کی ریاستوں میں موثر مداخلت کے قابل ہو چکے ہیں۔ اکبر کے لیے یہ پریشانی غالباً زیادہ تھی کہ وہ سمندر آشنا ان غیر ملکیوں کی مؤثر سرکوبی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ سمندری علاقے اس کی سلطنت میں پوری طرح شامل نہیں تھے لیکن ترخان خاندان پر سے اس کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ اسی سال میرزا عیسے مر گیا۔ اس کا جانشین میرزا باقی ہوا۔ پرتگیزیوں کو بکھر کے سلطان محمود کے خلاف امداد کے لئے بلانے والوں میں میرزا باقی بھی یقیناً شامل تھا۔

سید حسام الدین راشدی لکھتے ہیں "میرزا باقی ترخان اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ڈرتا تھا کہ اکبر سندھ پر حملہ نہ کر دے اس نے سید جلال ثانی کو اپنا سفیر بنا کر دربار اکبری میں بھیجا اور اپنی ایک لڑکی بھی حرم شاہی کے لیے بھجوائی۔ اکبر بادشاہ نے میرزا باقی کے تحائف رد کر دیئے مگر سید جلال کے کہنے پر سندھ پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ہمایوں کی انتہائی بے بسی کے دنوں میں اکبر پیدا ہوا تو جو کپڑا سب سے پہلے اسے پہنایا گیا تھا وہ سید جلال کے والد سید علی ثانی کے استعمال شدہ کپڑے سے بنایا گیا تھا۔

اعجاز الحق قدوسی تاریخ سندھ میں لکھتے ہیں۔ میرزا محمد باقی کی ناشائستہ حرکات اور مظالم پر بلا تخصیص مذہب و ملت لوگ اس قدر تنگ آ چکے تھے کہ مسلمان مسلمانوں میں اور ہندو اپنے مذہبی

مقامات میں "ہو" کر کے دعا کرتے تھے کہ اللہ تعالےٰ ایسے ظالم اور بد خو بادشاہ کو دنیا سے نابود کر دے ......اس نے حرم سرا کی عورتوں کی شلواروں میں بلیاں چھڑوائیں، ان کی چھاتیاں کٹوادیں، مردوں کو ہاتھیوں کے پیروں سے بندھوا کر گلی کوچوں میں گھسٹوایا۔۔۔۔

۹۹۳ھ ۱۵۸۵ء کی ۸ شوال کو میرزا باقی نے اپنے پیٹ میں تلوار مار کر خود کشی کر لی۔

میرزا باقی کے بعد نمایاں حکمران میرزا جانی بیگ ہے۔ اسے اکبر کا پیغام ملا کہ تم قدیم زمانے کی طرح ہمارا خطبہ پڑھنا لازمی سمجھتے آئے ہو بہتر یہ ہے کہ آج کے بعد سے سکہ اور تحائف بھی سال بسال پیش کرنا لازم سمجھو اور اپنے بزرگوں کے طریقے کے مطابق ہماری بندگی کو اپنا فرض جانو۔۔۔

میرزا جانی بیگ نے فرمان کی تکمیل کی اور اپنے بھائی میرزا شاہ رخ کو اکبر کے دربار میں بھجوا دیا۔

تاریخ طاہری میں ہے کہ میرزا جانی بیگ، شاہ رخ کے ذریعے اپنی عرض داشت اکبر کو بھجوا کر مطمئن ہو کر بیٹھ گیا اور بہترین عادات و خصائل کو چھوڑ کر بُری عادات و اطوار میں مبتلا ہو گیا۔ وہ اعلانیہ اغلام کرتا اور خوب صورت لڑکوں کو بہترین لباس پہنا کر عورتوں کی جگہ اپنے گھر میں رکھتا۔ اس نے ایسے ایسے شریف گھرانوں کے لڑکوں کو خراب کیا کہ ان کا نام لینا ادب کے خلاف ہے لوگ اس کے ان ناشائستہ افعال کو دیکھ کر استغفار پڑھتے تھے۔

اکبر نے میرزا جانی کی عادات، شہرت اور پرتگیزیوں کے مسلسل زور پکڑنے کے سبب اپنے بکھر کے گورنر صادق محمد خان کو اس کی سرزنش کے لیے بھیجا مگر وہ اتنا کامیاب نہ ہوا۔ تاریخ معصومی کے مطابق اکبر کے غضب ناک ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب اکبر لاہور میں تھا تو میرزا جانی بیگ نے اطاعت و فرمانبرداری کی شرطیں پورے طور پر ادا نہیں کیں اور خود مختاری کا انداز اختیار کر لیا۔ ملا نظام الدین ہروی نے "طبقات اکبری" میں لکھا ہے کہ جانی بیگ نے تحائف بھیج کر اپنی نیازمندی کا اظہار کیا مگر خود حاضر نہ ہوا۔ چنانچہ اکبر نے میرزا عبدالرحیم خان خاناں کو ملتان اور بکھر کا گورنر مقرر کیا اور یہ بھی حکم دیا کہ وہ ٹھٹھہ یعنی جانی بیگ کو مسخر کرے۔ میرزا جانی بیگ اپنے بھائی میرزا مظفر سے زبردست جنگ لڑ کر نہ صرف اسے شکست دے چکا تھا بلکہ اسے سرزمین سندھ

سے بھی نکال چکا تھا۔ دوسرے اس نے اکبر کے فرستادہ بھکر کے حاکم محمد صادق خان کے حملے کو بھی ایک طرح سے ناکام بنا دیا تھا اس لئے میرزا جانی بیگ سے ٹکر لینا یقیناً ایک مشکل کام تھا اور خان خاناں کو کامیابی کے لیے صرف شاہی لشکر ہی نہیں غیبی یا روحانی امداد اور دُعا کی بھی ضرورت تھی۔

محمد پیر نے حقیقت الفقراء میں فتح ٹھٹھ پر ایک پورا باب لکھا ہے جس میں بتایا ہے کہ خان خاناں نے لاہور کے شاہ حسین سے بھی اشیرواد حاصل کی اور ملتان کے بالا پیر سے بھی تحفۃ الکرام میں درج ہے کہ اس نے ہالہ کے مخدوم نوح کی بھی روحانی امداد حاصل کی۔

محمد پیر لکھتا ہے کہ خان خاناں اور ابوالفضل میں بڑے ہی قریبی مراسم تھے اور خان خاناں ایک طرح سے ابوالفضل کو اپنا استاد مانتا تھا۔ جب خان خاناں کو تسخیر ٹھٹھ کا حکم ملا تو اس نے ابوالفضل سے پوچھا کہ:

کہ دریں شہر کیست مردِ خدا　　عاشق پاک اہل دردِ خدا
تا بروا التجا برم پئے آں　　کہ ازو کارِ من شود آساں

(اس شہر میں کون مردِ بزرگ ہے جس سے میں اپنے حق میں دُعا چاہوں کہ میری مہم کامیاب ہو)۔

اس کے جواب میں ابوالفضل نے کہا:

شیخ گفتش کہ مردِ بے شک وشین　　اندر شہر ہست شاہ حسین
کہ نوازد ترا بیک دشنام　　سازدت کارہا تمام بکام

(بلاشبہ اس شہر میں حسین ایسا خدا رسیدہ بزرگ موجود ہے جو اگر تجھے گالی بھی دے دے تو تو سمجھ تیرا کام ہو گیا)۔

خان خاناں شاہ حسین کو جانتا تھا مگر اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ شاہ حسین دربار کے لوگوں سے سخت نفرت کرتے ہیں اور انہوں نے بادشاہ سے بھی کہہ دیا تھا کہ انہیں دربار میں کبھی نہ بلایا

جائے اور نہ ان کے پیچھے کسی کو لگایا جائے۔ لیکن یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ بڑے بڑے درباری اور روزیر شاہ حسین سے ملنا عین سعادت سمجھتے تھے اور جب موقع ملتا تھا ان سے مل لیتے تھے۔ ان میں شیخ ابوالفضل بھی تھا جس نے خان خاناں کو اپنے ساتھ شاہ حسین کے پاس لے جانے کی حامی بھرلی۔ لیکن خان خاناں کو بتا بھی دیا کہ حسین امراء سے زیادہ خوش کلامی کا مظاہرہ نہیں کرتے اس لئے ان کی باتوں سے اسے رنجیدہ نہیں ہونا چاہیئے اور یہ کہ حسین سے ملنے کا وقت نصف شب کے بعد کا ہے۔

اس روز حسین نے ایک طرح سے دوستوں کی دعوت کر رکھی تھی اور خاص میٹھے نان تیار کئے گئے تھے حسین کی مجلس رقص و سرود بھی جاری تھا اور کام و دہن کی آزمائش بھی ہو رہی تھی شراب بھی چل رہی تھی اور سرمستی بھی۔ اس اثنا میں حسین نے اپنے دوست سے کہا کہ وہ دو نان بچا کر رکھے۔ دوست حیران ہوا کیونکہ کسی کی خاطر مے شبانہ بچانے کی روایت شاہ حسین کی نہ تھی بہرطور حسین کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ جب آدھی رات کی نوبت بجی تو گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ حسین نے کہا دروازہ کھول دو کہ جن کے لئے نان رکھے ہیں وہ آگئے ہیں۔ دروازہ کھلا تو شیخ ابوالفضل اور خان خاناں دونوں پورے ادب کے ساتھ شاہ حسین کی خدمت میں آئے۔ خان خاناں نے اپنا سر حسین کے پاؤں پر رکھ دیا اور حسین کے قدموں میں پانچ سو درہم رکھ دیئے۔

شاہ حسین نے شیخ ابوالفضل اور خان خاناں کو بیٹھنے کی اجازت دی اور نان منگوا کر ان دونوں کو دیئے۔

داد شاں نان و داد ہم دشنام   شیخ آگاہ بود کرد سلام

(یعنی دونوں کو نان بھی دیئے اور گالیاں بھی دیں۔ شیخ ابوالفضل حسین کے اس انداز سے واقف تھا اس لئے اس نے اظہار تشکر کے طور پر حسین کو سلام کیا)

حسین نے خان خاناں سے کہا کہ ہم نے ٹھٹھہ تمہارے نام کر دیا ہے مگر اس رقم کے عوض نہیں کیونکہ فقیروں کے لیے بڑی سے بڑی رقم کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ تم بھی جب درویشوں

کہ کوئی چیز دو تو خدا کے نام پہ دیا کرو، دنیاوی اغراض کی تکمیل کے لئے نہ دیا کرو۔ یہ کہہ کر شاہ حسین نے وہ پیسے لوگوں میں تقسیم کر دیئے۔ شیخ ابوالفضل سارے انداز سے بخوبی واقف تھا اس نے سوچا خان خاناں کی مراد بر آئے گی۔ اس کے بعد دونوں نے اجازت لی اور رندوں کی محفل سے نکل کر اپنی حویلیوں میں چلے گئے۔

خان خاناں لاہور سے روانہ ہوا، ملتان پہنچا اور حضرت بہاؤالدین ذکریا کے مزار پر حاضری دی۔ مزار کا طواف کیا اور سجادہ نشین شیخ کبیر عرف بالا پیر کے پاس حاضری بھی دی اور دو سو روپے بالا پیر کی نذر کئے۔ بالا پیر نے وہ رقم رکھ لی مگر دوسری صبح وہ رقم خان خاناں کو واپس بھجوا دی۔ خان خاناں کو سخت حیرت ہوئی اور اندر سے دھڑک کر رہ گیا کہ کیا ٹھٹھہ کی تسخیر اس کا مقدر نہیں۔ وہ بالا پیر کے پاس حاضر ہوا اور پوچھا کہ اس سے کوئی گستاخی ہو گئی ہے کہ رقم واپس کر دی۔ بالا پیر نے کہا کہ نہیں یہ بات نہیں، رات ہمارے بزرگ (بہاؤالدین ذکریا) خواب میں آئے تھے ان کا حکم تھا کہ یہ رقم تمہیں واپس دے دوں۔ تم نے یہ رقم فتح ٹھٹھہ کے لئے نذر گزاری تھی مگر جدِ امجد نے بتایا کہ شاہ حسین نے ٹھٹھہ تمہارے نام کر دیا ہے اور تم نے انہیں پانچ سو روپے دیئے۔۔۔۔ پھر اس مقصد کے لئے تم نے یہاں پر بھی رقم دی۔۔۔۔ جو مقصد پہلے ہی پورا ہو چکا ہے اور جس کا وعدہ شاہ حسین نے کر لیا ہے اس کے لئے ہم کیسے کوئی نذر قبول کر سکتے ہیں۔ اس لئے یہ رقم تم کو واپس کر دی اور ٹھٹھہ کی فتح کی خوشخبری بھی تمہیں دے دیتے ہیں۔ خان خاناں یہ سُن کر بڑا حیران ہوا اور اس کے دل میں شاہ حسین کی عظمت اور بھی بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ رقم بالا پیر کو خدا واسطے پر دی اور اسے حسین کی بات یاد آئی کہ فقیروں کو اپنی غرض پوری کرنے کے لئے نہیں صرف خدا کی راہ میں رقم دینی چاہیئے۔

خان خاناں کے لئے میرزا جانی بیگ سے معرکہ بہت معنی رکھتا تھا وہ دکن میں اپنے جوہر دکھا چکا تھا اور وہاں کامیابی کے بعد اسے خان خاناں کا خطاب ملا تھا اب ایک تو خطاب

"خان خاناں" کی توقیر باقی رکھنا مقصود تھی دوسرے مزید درجات کے لیے فتح حاصل کرنا ضروری تھا جبکہ دوسری طرف میرزا جانی بیگ جیسا دلیر دشمن تھا جس کے بارے میں مآثر رحیمی میں درج ہے کہ "میرزا جانی بیگ نہایت سخی، خرچ کرنے والا، نامدار اور کامگار انسان تھا" میرزا جانی بیگ پہلے محمد صادق کو ناکام بنا چکا تھا پھر میرزا عیسےٰ ترخان اور خود میرزا جانی بیگ کے فرنگیوں سے روابط بھی پریشان کن تھے اس لئے خان خاناں کے دل میں طرح طرح کے وسوسے سر اٹھاتے تھے اور وہ شاہ حسین، بالا پیر اور حضرت نوح مخدوم کی اخلاقی اور روحانی امداد کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔

خان خاناں کو سندھ کی تسخیر میں جن مشکل مراحل کا سامنا کرنا پڑا اس کا ذکر "تاریخ معصومی" اور "تاریخ طاہری" کے حوالے سے اعجاز الحق قدوسی نے "تاریخ سندھ" میں درج کئے ہیں۔ خان خاناں کے سندھ کی طرف رخ کرنے کی خبر جب ٹھٹھہ میں میرزا جانی کو ملی تو اس نے اپنے مدبرین سے مشورہ کیا۔ اکثریت کی رائے تھی کہ میرزا باقی کی بیٹی "سندھی بیگم" کو جو اکبر کے محل میں داخل ہو چکی ہے۔ پرانے فرمانوں اور عہدناموں کے ساتھ خان خاناں کے پاس بھیجنا چاہیے اور خان خاناں کو بتانا چاہیے کہ ہمیں بندۂ درگاہ تصور فرمائیں اور ایک عرضی ہماری طرف سے اکبر بادشاہ کو بھجوا دیں۔۔۔۔ میرزا جانی بیگ نے یہ کہہ کر اس مشورہ کو مسترد کر دیا کہ سخاوت، شجاعت کے مدعیوں کا عورتوں کی طرح زندگی بسر کرنا شیوۂ مردانگی نہیں محض ایک ضمنی ملک کی خاطر جو ہمیشہ کسی کی ملک نہیں رہا اور ایسے تن کے لیے آسائش ڈھونڈنا جو ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں ہے، بہت بڑی بزدلی ہے میں اس طوق بدنامی کو اپنے گلے میں نہیں ڈالنا چاہیے کہ سلسلہ ترخانی کے فلاں شخص نے نامردی و بزدلی اختیار کی۔۔۔۔ میں تم لوگوں میں سے انہیں جو خوف کی وجہ سے اپنی اور اپنی اولاد کی جان کو عزیز رکھتے ہیں، بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ وہ جہاں جی چاہے چلے جائیں۔۔۔۔ آخر یہ طے پایا کہ اکبر بادشاہ کی فوج سے ٹکر لی جائے۔۔۔۔ میرزا جانی بیگ نے رستم بیگ کو ایک بڑا لشکر دے کر سیہون بھیجا اور کہا کہ قلعہ بند ہو جائے۔ قلعے کے باہر کی

آبادی کو ہموار کر دے اور خود لشکر لے کر نصر پور کے موضع بوہری میں پہنچ گیا۔

خان خاناں بکھر پہنچا، سرداروں سے مشورہ کیا کہ پہلے سیہون جانا چاہیئے یا ٹھٹھ کو جہاں میرزا جانی سے ٹکر لی جائے، قرار پایا کہ سیہون راستے میں ہے اس لئے پہلے ادھر اور پھر ٹھٹھ کو۔۔ خان خاناں نے دریائے سندھ عبور کیا اور لشکر سیہون کے چاروں طرف مورچے تعمیر کرنے اور سرنگ لگانے میں مصروف ہو گیا۔

طبقات اکبری کے مطابق جب خان خاناں کو معلوم ہوا کہ میرزا جانی بیگ سندھ کے زمینداروں کے ساتھ سامانِ حرب سے لیس ہو کر آ رہا ہے تو اس نے سیہون کا محاصرہ ترک کر دیا اور اس کے مقابلے کے لئے روانہ ہوا۔ یہ مقابلہ ۶ محرم ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) کو ہوا۔ خان خاناں کو فتح حاصل ہوئی۔ ۔ ۔ ۔ میرزا جانی بیگ نے اپنے لشکر میں اعلان کیا تھا کہ جو کوئی دشمن کا سر لائے گا اسے بطور انعام پانچ سو کبر دیئے جائیں گے۔ سندھ کے غریب یہ انعام حاصل کرنے کے لیئے ہر روز سر دے کر سر لاتے تھے۔ کئی ماہ اسی طرح گذر گئے۔ میرزا نے سنا تھا کہ خشکی کے راستے سے خان خاناں کا خزانہ آتا ہے اس نے ابوالقاسم کو حکم دیا کہ جہاں بھی سرکاری خزانہ ملے لوٹ لیا جائے۔ ابوالقاسم نے ایک بار یہ خزانہ لوٹ لیا مگر اس میں خود اس کے بہت سے آدمی مارے گئے۔

خان خاناں اور میرزا جانی بیگ کے لشکروں کی پہچان یہ تھی کہ شاہی فوج کے سپاہیوں نے اپنی پگڑیوں میں تیر لگائے اور میرزا جانی بیگ کے لشکریوں نے پگڑیوں میں درختوں کی سبز ٹہنیاں باندھیں۔ جنگ اس قدر سخت تھی کہ پہلے جانی بیگ کا پلہ بھاری نظر آتا تھا۔ خان خاناں اپنے عساکر کی پسپائی دیکھ کر بددل ہو رہا تھا عین اسی وقت میرزا کا ایک مست ہاتھی جو لشکر کے آگے آگے تھا بھڑک اٹھا اور پلٹ کر اپنی ہی فوج کو روندنا شروع کر دیا۔ دوسرے جانی بیگ کی فوج کے سامنے کے رُخ سے ایسی زوردار آندھی چلی جس سے فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔ فوج اسلحہ چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ جانی بیگ نے میدان چھوڑنے سے انکار کر دیا مگر امراء کے سمجھانے پر

وہ میدان جنگ سے ہٹا اور کشتی پر سوار ہو کر انظرپور پہنچا اور فیصلہ کیا کہ یہاں خندقیں کھود کر خان خاناں سے محفوظ رہے گا۔ اسی اثنا میں مفرور فوج پھر جمع ہو جائے گی۔

خان خاناں کے لئے بھی امتحان کڑا تھا وہ خاصے عرصے سے میرزا کو زیر کرنے میں مصروف تھا مگر مقصد حاصل نہیں ہو رہا تھا اس نے بھی مقابل میں خندقیں کھود لیں۔۔۔۔ جانی بیگ نے ٹھٹھہ میں اپنے والد میرزا محمد پائندہ بیگ کو لکھا کہ آپ اور محل والے کلاکوٹ کے قلعے میں چلے جائیں۔ ٹھٹھے میں سے لوگوں کو نکال کر ہر کوچہ و بازار میں آگ لگا دیں۔ جہاں تک ممکن ہو ہر پرگنے، قصبے اور گاؤں کو برباد کر دیں۔۔۔ اور ٹھٹھہ اسی طرح ایک بار پھر اُجڑ گیا۔

خان خاناں نے سندھ کو اس تباہی سے بچانے کے لئے اپنے صوبیدار بھیجے کہ وہ میرزا جانی بیگ کے صوبیداروں کو زیر کر کے حالات کو ٹھیک کریں۔۔۔ خان خاناں کے آدمیوں کا نیرون کوٹ کے قلعہ پر قبضہ ہوا۔ ساکرہ بھی زیر ہوا۔ بدین کے صوبیدار نے خان خاناں کی اطاعت قبول کر لی۔ میرزا جانی بیگ کو اپنے بے بس ہونے کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ دوسری طرف اس کے والد کے انتقال کی خبر آئی اور پھر کچھ عرصہ بعد اسے اپنے بیٹے ابوالفتح کی موت کی اطلاع ملی۔۔۔ میرزا جانی بیگ اور اس کے واپس آنے والے کچھ لشکر پر سارے راستے بند تھے۔۔۔ خان خاناں اور جانی بیگ کے لشکر اس قدر قریب تھے کہ دونوں کے سپاہی آپس میں بات چیت کر سکتے تھے۔۔۔۔ میرزا جانی بیگ تخت یا تختہ میں یقین رکھنے والا آدمی تھا۔

تاریخ معصومی کے مطابق دونوں فریقوں میں روزانہ جھڑپیں ہوتیں۔ بہت آدمی قتل ہوتے رہے۔ خان خاناں نے مناسب جانا کہ مزید نقصان نہ ہو اور اپنا ایلچی میرزا جانی کے پاس بھیجا۔۔۔۔ میرزا جانی نے کہا سیہون کا قلعہ آپ کے سپرد کرتا ہوں، خود ٹھٹھہ پہنچوں گا تب آپ سے ملاقات کروں گا۔ اس میں خان خاناں کی کچھ تذلیل کا پہلو بھی نکلتا تھا۔ امراء نے مخالفت کی مگر خان خاناں نے بات مان لی۔ سیہون کا قلعہ مل گیا۔ جانی بیگ ٹھٹھہ روانہ ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے خان خاناں ٹھٹھہ پہنچا۔۔۔

میرزا جانی بیگ نے ہار مان لی۔ بادشاہ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے لئے تغلق آباد چلا گیا۔ خان خاناں رعایا کی دلجوئی کے لیے ٹھٹھ میں ٹھہر گیا۔۔۔ آخر جانی بیگ کو اکبر کے دربار میں ۱۰۰۱ھ میں بھیج دیا گیا بلکہ خان خاناں حوالے کر گیا۔ پنج ہزاری کا منصب دیا۔ جہانگیر کے بیٹے خسرو کی شادی جانی بیگ کی بیٹی سے کی۔ سیہون اور لاہری یا لاہوری بندر (یعنی فرنگیوں سے رابطہ کا راستہ) اپنی تحویل میں لے کر باقی علاقہ جانی بیگ ہی کی جاگیر میں دے دیا۔۔۔ جانی بیگ آٹھ سال تک اکبر کے دربار میں رہا۔ ۱۰۰۹ھ یعنی شاہ حسین کی وفات کے ایک سال بعد جانی بیگ کی وفات برہان پور میں ہوئی جہاں وہ بادشاہ کے ساتھ تھا۔

سندھ کے اس سخت جان اور ہر حیہ بادا باد میں ایمان رکھنے والے حاکم سے نمٹنا واقعی مشکل کام تھا اور اس مشکل کام میں کامیابی کے لئے خان خاناں نے شاہ حسین سمیت کئی زندہ بزرگوں کے ہاں حاضری دی اور کئی مزاروں کا طواف کیا۔ تحفۃ الاکرام میں ہے۔

"کہتے ہیں کہ جب خان خاناں اس مشکل مہم (تسخیر سندھ) کو سرانجام دینے کے لئے مامور کیا گیا تھا تو وہ صادق خان کی ناکام واپسی سے فکر مند ہو گیا تھا اور جو بھی اہل اللہ اسے نظر آتا تھا اس سے وہ اپنی فتح مندی کے لئے دعا کی درخواست کرتا تھا۔ ایک بزرگ سے نقل ہے کہ کسی اہل اللہ نے اسے بتایا کہ حال ہی میں جناب کرامت مآب شیخ الشیوخ مخدوم نوح ہالہ کنڈی علیہ الرحمۃ نے ہالہ کنڈی میں انتقال کیا ہے۔ اگر ان کی فاتحہ خوانی کے لیے پہلے تم جا پہنچے تو تم مظفر و منصور ہو گے لیکن اگر مرزا جانی بیگ پہلے جا پہنچا تو وہ فتح یاب ہو گا۔ خدائے پاک کی تائید کا اتفاق دیکھئے کہ جانی بیگ اس قدر نزدیک ہوتے ہوئے بھی اس بخشش رحمانی کے خزانہ کی کنجی (مخدوم نوح) کی فاتحہ خوانی کے لیے ابھی پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ (خان خاناں) اس سے پہلے ہی بازی لے گیا۔

محمد میر لکھتا ہے کہ جب خان خاناں فتح یاب ہو کر لاہور آیا تو کمال ارادت کے ساتھ شاہ حسین کے پاس حاضر ہوا۔

کرد چوں جمع خاطر از سوئے شاہ — باز آمد بر حسین از راہ کو

در دلِ خود بدوں ارادت یافت — زاں ارادت بسے سعادت یافت

تسخیر سندھ کے حوالے سے قطع نظر مرزا عبدالرحیم خان خاناں سے شاہ حسین کا ایک دوسرا رشتہ بھی تھا۔ اور وہ رشتہ تھا مقامی زبان میں شعر کہنے کا۔ خان خاناں کو مقامی زبان شیرِ مادر کے ساتھ ملی تھی کہ اس کی ماں میوات کے ایک سردار کی بیٹی تھی جس سے بیرم خان کی شادی ہوئی۔ اس لڑکی کی دوسری بہن سے بادشاہ ہمایوں نے شادی کی تھی۔ خان خاناں کی پرورش اکبر کی نگرانی میں شاہی محل میں ہوئی تھی جب بیرم خان کا انتقال ہوا اس وقت عبدالرحیم بمشکل چار برس کا تھا۔ وہ اس اعتبار سے لاہوری تھا کہ مآثر الامراء کے مطابق ۱۴ صفر ۹۶۴ھ (۷ دسمبر ۱۵۵۶ء) کو لاہور میں پیدا ہوا۔ اکبر کی حکومت کا یہ پہلا سال تھا۔ اکیسویں سال میں اسے گجرات کی سرداری دی گئی۔ اس سے پہلے خان اعظم کوکہ کی بہن ماہ بانو سے اس کی شادی ہو چکی تھی۔ چار برس بعد اسے اکبر کا میرِ عرض مقرر کیا گیا۔ اسی سال اس نے سلطان مظفر گجراتی پر فتح پائی۔ اس کے بعد پھر مفرور سلطان مظفر سے مقابلہ ہوا جس میں خان خاناں کا پلہ بھاری رہا۔ اسے پنج ہزاری منصب دیا گیا اور خان خاناں کا خطاب ملا۔ چونتیسویں سالِ جلوس اکبری میں اس نے بادشاہ کے حکم سے تزک بابری کا ترکی سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور شہرت کمائی۔

خان خاناں قابلیت اور استعداد میں یکتائے زمانہ تھا۔ عربی۔ فارسی، ترکی اور ہندی میں مشاق تھا۔ شعر خوب سمجھتا اور کہتا تھا۔ رحیم تخلص کرتا تھا اس کی سخاوت اور عالی ہمتی ہندوستان بھر میں ضرب المثل تھی۔ خود فارسی ہندی اور سندھی میں شعر کہتا تھا۔ اس کے دوہے ہندی ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اس کا والد بیرم خان (خان خاناں) فارسی کا بہت اچھا شاعر تھا بلکہ بیرم کا درجہ رحیم سے بلند سمجھا جاتا ہے۔

اکثر شاعروں کو وہ صلے میں اشرفیوں سے تولتا تھا۔ ایک دن مُلّا نظیری نیشاپوری نے کہا کہ لاکھ روپے کا ڈھیر کتنا ہوتا ہے میں نے نہیں دیکھا۔ حکم دیا کہ خزانے سے لائیں۔ جب جمع

ہوگیا تو ملّا نے کہا خدا کا شکر ہے کہ میں نے نواب کی وجہ سے اتنا روپیہ دیکھ لیا۔ حکم دیا کہ یہ سب روپیہ مُلّا نظیری کو دے دیا جائے تاکہ خدا کا شکر کرے۔

ہمیشہ بڑی بڑی رقمیں درویشوں اور شاعروں کو ظاہر اور پوشیدہ دیا کرتا تھا اور دور رہنے والوں کو سالانہ رقوم بھیجتا تھا۔ اس کے زمانے میں ہر فن کے باکمال لوگ اس طرح جمع رہتے تھے جیسے سلطان حسین مرزا اور میر علی شیر کے زمانے میں رہا کرتے تھے۔ اس کے حلقہ میں رہنے والے نمایاں فارسی شاعروں میں مُلّا نوعی، عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری، مرشد یزدجردی، شکیبی صفاہانی وغیرہ تھے" مقالات الشعراء" کے مصنف کا خیال ہے، مغل امراء میں سے کوئی بھی فیاضی و سخاوت میں خان خاناں کے ہمسر نہ تھا۔ فارسی کے چند شعر یوں ہیں۔

شمارِ شوق نہ دانستہ ام کہ تا چند است
جُز ایں قدر کہ دلم سخت آرزو مند است
نہ دام دانم و نے دانہ ایں قدر دانم
کہ پائے تا بسرم ہرچہ ہست در بند است
مرا فروخت محبت ولے ندانستم
کہ مشتری چہ کس است و بہائے من چنداست

نیاز فتح پوری نے اپنے کتابچے "جذبات بھاشا" میں لکھا ہے "عبدالرحیم خان خاناں ۱۶۱۰ بکرمی میں پیدا ہوئے۔ بیرم خان کے لڑکے اور اکبری نورتن کے ایک رتن تھے۔ انہوں نے بھاشا زبان میں وہ کمال پیدا کیا کہ اس زبان کے مستند شعراء میں ان کو جگہ دی گئی۔ ان کا کلام ایسا مقبول ہوا کہ اکثر دوہے ان کے بطور ضرب الامثال عوام میں مشہور ہوگئے۔ ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف میں ان کو خاص مذاق حاصل تھا۔ رحیم اور رحمٰن تخلص ہے"۔

جذبات بھاشا میں شامل چند دوہے:

ٹین کاٹ دھویئے کھائیے آدھک پیاس
رحمن پیت سراہیئے موئے میت کی آس

(مچھلی جب صاف کی جاتی ہے پانی سے دھوئی جاتی ہے جب کھائی جاتی ہے تو پیاس بہت لگتی ہے۔ یعنی پانی کی طلب ہوتی ہے۔ صدآفرین اس محبت پر جو فنا ہونے پر بھی اس قدر جذب آرزو رکھے۔)

من سے نہیں رحیم نرپ درگ سے نہیں دوان
دیکھ نین چھ آگرین من کتی ت بک جان

(اے رحیم قلب سا کوئی بادشاہ نہیں۔ اور نگاہ سے بہتر کوئی وزیر و ندیم نہیں (جس کا یہ رسوخ و اعتبار ہے کہ) جس کی عزت یہ کرے قلب اسی کے ہاتھ بک جائے)۔

رحمن دھاگہ پریم کا جن توڑو چٹکائے،
توڑے سے جڑے نہیں بیچ گانٹھ پڑ جائے

(محبت کو مت توڑو کیونکہ ایک بار ٹوٹنے کے بعد اول تو اس کا جڑنا محال ہے (اگر کسی طرح جڑ بھی گیا تو بیچ میں گرہ ضرور پڑ جائے گی)

چھ رحیم تن من دیو کیتو ہردے بیں بھون
تا سے دکھ سکھ کہے کی رہی کتھا اب کون

(جس کو اپنا تن من سونپ دیا جس کو اپنے من میں جگہ دی پھر اس سے راحت و تکلیف کا ذکر ہی کیا۔ یعنی وہ دکھ دے یا سکھ دے، اس کی دین ہے اس لئے نہ کوئی شکوہ ہے نہ گلہ۔

داراشکوہ نے حسنات العارفین میں شاہ حسین کا ایک جگہ ایسے انداز میں ذکر کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا فارسی کا ذوقِ شعری غیر معمولی تھا۔ انہوں نے حافظ کے ایک شعر پر فنی نکتہ نظر کی بجائے جذباتی اور نظریاتی اعتبار سے اپنے تاثر کا عملی اظہار کیا ہے۔ دوسری ان کی اپنی

پنجابی شاعری ہے جس کا حسن اسلوب اور سوز و گداز آج چار سو سال گزرنے کے باوجود قائم ودائم ہے کہ حالات کے ساتھ ساتھ نئے نئے رنگ و معانی ان سے پیدا ہوتے ہیں۔ حسین نے کافی تو خیر کہی ہے مگر دوہے بھی کہے ہیں جس کے بانی پنجابی میں بابا فرید گنج شکر ہیں۔

عبدالرحیم خان خاناں کے لیے ٹھٹھہ کی تسخیر کی دعا کرنے کے علاوہ دونوں میں شاعری کا رشتہ بھی ہے لیکن ان رشتوں کے باوجود حسین کو نہ خان پسند ہیں نہ خان خاناں۔ ایک کافی کے مصرعے ہیں۔

اک عرض نمانیاں دی سن جندڑی

کاہے گربھیں ویکھ جوانی، تیں جیہیاں کئی خان خوانی

کال لٹیاں سبھ چن جندڑی

اے زندگی، ان خاک نشینوں کی ایک بات سن لے۔

اپنی بھری پری جوانی دیکھ کر مغرور مت ہو۔

تجھ جیسی کئی خان خوانیاں (یعنی زیادہ جوان زیادہ بلند مرتبہ خان خاناں جیسے لوگ)

موت نے چن لی ہیں۔

جوگی، جوگ اور حسین

نور احمد چشتی نے شاہ حسین کے مزار کی تعمیر کی جو تفصیل بیان کی ہے اس میں ایک ایسے واقعہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کا ذکر حقیقت الفقرا میں نہیں مگر بعد کی دوسری بے شمار کتابوں میں اسے دہرایا گیا ہے۔ شاہ حسین کی بابو پورہ کے زمیندار بابو سے دوستی تھی، دوسرے مادھو لال کو آخری سبق معرفت انہوں نے اسی علاقے میں دیا تھا اور اس کے بعد ہی اسے راجہ مان سنگھ کی ملازمت پہ دکن کی طرف بھیج دیا تھا اور تیسرے اپنے دوستوں کو اکٹھا کر کے وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد انہیں راوی کے کنارے شاہدرہ میں دفن کیا جائے، جہاں وہ تیرہ سال دفن رہیں گے اس کے بعد جب دریا کے سیلاب سے ان کی قبر دھنس جانے والی ہو گی ان کی نعش کو وہاں سے نکال کر بابو پورہ (اب باغبانپورہ) میں دفن کیا جائے۔

نور احمد چشتی لکھتے ہیں "جب وہاں سے حسب وصیت ان (شاہ حسین) کے یہاں بابو پورہ میں جنازہ حضرت کا لے کے آئے تو یہ معاملہ پیش ہوا کہ اس وقت یہاں بمقام مدفن مکان جوگیان گورکھ ناتھ کا تھا اور وہاں ایک جوگی مسمی پیر گورکھ ناتھ مع چیلا رہا کرتا تھا مگر کچھ عمارت موجود نہ تھی جب جنازہ نیض انداز آیا تو وہ جوگی دفن سے مانع ہوا اور بولا کہ مکان ہنود ہے یہاں مسلمان کی قبر ہونی امر محال

ہے۔ اس وقت حضرت کی لاش سے آواز آئی کہ اے جوگی! فلانی جگہ کو۔۔۔ کہ اب جہاں حضرت کی قبر ہے۔۔۔ کھود۔ اگر وہاں سے تسبیح اور مصلا اور قرآن شریف اور دستار سرخ نکلے تو مکان ہمارا ورنہ تیرا۔ غرض جب اس جگہ کو کھودا تو اسباب بجنسہٖ وہاں سے نکلا۔ جب وہ نادم ہوا تو اس نے عرض کی کہ اب میں کہاں جاؤں؟ ارشاد ہوا کہ بمقام ٹلہ گھد وگور کھ ناتھ جا کر رہ۔۔۔ وہ تو ادھر روانہ ہوا اور یہ کرامت حضرت کی دیکھ کر ایک لائق منجملہ اس کا حضرت کا خادم مشرف بہ اسلام ہوا جس کا نام خاکی دیوان رکھا گیا اور اس کی قبر زیر درخت وَن اندر چار دیواری حضرت کے موجود ہے اور حضرت وہاں ہی یعنی اس جگہ گندیدہ میں دفن ہوئے اور اس خاکی دیوان کو حضرت کی طرف سے حکم ہوا کہ یہ دستار سرخ امانت مادھو محبوب ہمارے کی ہے جب وہ آویں تو یہ امانت ہماری ان کو دے دینا۔۔۔۔"

کرامت سے قطع نظر یہ حقیقت ہے کہ ہمارے اکثر اولیائے کرام (جن میں حضرت داتا گنج بخش اور خواجہ معین الدین چشتی بھی شامل ہیں) کو ان جوگیوں سے جگہ جگہ اور بار بار واسطہ پڑا۔ اگرچہ اکثر واقعات جو ان کو پیش آئے ایک ہی نوعیت کے ہیں مگر محسوس یہی ہوتا ہے کہ صوفیائے کرام کو اگر ایک طرف کٹھ ملا قسم کے لوگوں کی یلغار کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا تو دوسری طرف غیر مسلموں میں مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے جوگیوں کی شعبدہ بازی کا جواب بھی کسی نہ کسی صورت دینا پڑتا تھا۔۔۔ گویا جوگی اپنی تنظیم، طریق اور شعبدہ سازی کے اعتبار سے یقیناً قابلِ ذکر تھے اور اس معاشرے میں خاص اہمیت کے حامل تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جوگیوں کے بارے میں خود مسلمانوں کے اندر ایک خاص طرح کا رومانوی تصور رائج ہو گیا۔ اردو شاعری میں محسن کاکوروی بلکہ ان سے پہلے نظیر اکبر آبادی سے لے کر معروف نظم "جوگی" کے خالق محمد ناظر تک اور ساری پنجابی شاعری میں جوگی کا خاص نوعیت کا تصور موجود ہے۔ خود شاہ حسین کہتے ہیں۔

رانجھن جوگی میں جوگیانی، کملی کر کر سدی آں

(یعنی رانجھا جوگی ہے اور میں اس کی جوگن ہوں)

ترکِ لذات کے حوالے سے شاہ حسین اور جوگیوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ سخت ریاضت اور عبادت بلکہ مجاہدہ میں بھی اشتراک بہت واضح ہے مگر جو بات ہم تک پہنچی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسین کو نہ تو جوگیوں کے اعتقادات سے کوئی دلچسپی تھی نہ ان کی کرشمہ سازی کو وہ مناسب جانتے تھے۔ یہ درست ہے کہ ان کے عہد میں ہندو مانتھا لوجی اور علوم بھی کم از کم غیر مسلموں کے لئے نصاب میں شامل کر دئیے گئے تھے اور ہندوؤں کی متعدد کتابوں کا جن میں مہا بھارت بھی شامل ہے فارسی میں ترجمہ کرایا گیا تھا۔ اس عہد کی افسر شاہی اور منصب داروں میں ایسے ایسے غیر مسلم بھی تھے جو جوگیوں وغیرہ کے بہت معتقد تھے اس لئے لامحالہ اس عہد کی طرزِ فکر پہ کہیں نہ کہیں اس صورتِ حال کا منفی یا مثبت یا دونوں کے امتزاج کا عکس تو پڑتا ہوگا۔ شاہ حسین نے جوگیوں کی شعبدہ بازی کی ایک طرح سے اس وقت مذمت کی جب ان کی زندگی میں ان کے پیر بھائی شیخ ارزانی نے ان سے اپنی روحانی توفیق کا مقابلہ کرنا چاہا۔ شیخ ارزانی کی دعوتِ مبارزت کے جواب میں شاہ حسین نے براہِ راست جوگیوں کے اندازِ شعبدہ کے بارے میں کہا:

جوگیاں نیز ایں ہنر دانند　　　صورتِ خویش بازگردانند

شیخ ارزانی نے شاہ حسین سے کہا تھا کہ وہ (شیخ ارزانی) انسانی شکل کی بجائے کوئی اور (چرند پرند) کی شکل اختیار کر لے گا۔ شاہ حسین کا کام یہ ہوگا کہ وہ اس کا سراغ لگائے اور اسے پکڑے، جس کے جواب میں حسین نے کہا کہ یہ تو وہ مرتبہ نہیں جو فقر و غنا سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ یہ ہنر تو جوگی لوگ بھی جانتے ہیں اس لئے تمہارا (شیخ ارزانی کا) اس میں کوئی کمال نہیں۔

بابو پورہ میں دفن کے وقت شاہ حسین کو بعد مرگ جن جوگیوں سے واسطہ پڑا انہیں گورکھ ناتھ کے سلسلہ کا جوگی بتایا گیا ہے۔ شاہ حسین سے پہلے پنجابی ادب میں جن جوگیوں اور ناتھوں کا نام ملتا ہے ان میں سے بھی زیادہ کا تعلق اسی پنتھ سے ہے۔ پھر لاہور شہر میں جن جوگیوں کو اس عہد اور اس کے بعد کوئی مقام حاصل رہا ان کا بھی اسی پنتھ سے واسطہ ہے۔ پنجابی کے کلاسکل ادب میں بھی خصوصاً ہیر رانجھے کے حوالے سے انہی جوگیوں کا ذکر ہے۔ نجابت نے اپنی وار نادر شاہ میں

جن جوگیوں کو نادر شاہ سے بھڑایا ہے اور جن کی بہادری کی خاصی تعریف کی گئی ہے وہ بھی یہی جوگی تھے، جنہیں کن پھٹے جوگی بھی کہا جاتا ہے۔ ان جوگیوں کے بہت سے ٹھکانوں میں ضلع جہلم میں ٹلہ بال ناتھ، ضلع گوجرانوالہ میں پنڈا کھا اور لاہور شہر میں تھان بھیرو شامل ہیں۔ پنجابی ادب میں راجہ رسالو یا پورن بھگت کا قصہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں سیالکوٹ کے حوالے سے جوگیوں کو بلند مرتبہ دیا گیا ہے۔

اکبر کے عہد سے پہلے مسلمان جوگیوں کا بھی ایک فرقہ شروع ہو گیا تھا۔ تحقیقات چشتی میں درج ہے کہ ایک جوگی جس کا نام شکر ناتھ تھا راجوری (مقبوضہ کشمیر) کے پہاڑوں میں ریاضت و عبادت میں مصروف رہتا تھا اس زمانے میں علاقے میں شکر کی قلت ہو گئی۔ علاقے کے مسلمان لوگوں نے جوگی سے شکر کی کمی کی شکایت کی اور کہا کہ تمہارا نام شکر ہے اگر تم نام کے سچے ہو تو ہمیں بھی شکر کھلاؤ۔ جوگی نے دعا کی کہ مسلمانوں نے مجھ سے شکر مانگی ہے میری لاج تیرے ہاتھ ہے ان کو شکر دے۔ دس رجب بروز دوشنبہ ۹۱۰ھ کو جوگی کی دعا قبول ہوئی اور اس علاقے میں شکر آسمان سے برسی۔ یہ دیکھ کر مسلمان بھی جوگی کے معتقد ہوئے۔ راجوری میں یہ مقام "مکان شکر ناتھ" کے نام سے مشہور ہوا اور اس جوگی کے گورو کا نام بڈلیسر تھا چنانچہ بڈلیسر کا قصبہ اس کے نام پر مشہور ہوا۔ شکر ناتھ کا مکان اب پیر جعفر کے مکان کے نام سے مشہور ہے۔

قصہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ جب شکر ناتھ جوگی کا آخری وقت قریب آیا تو اس عالم میں اس نے آواز دی کہ کوئی ہے؟ اتفاقاً وہاں جعفر نامی ایک غریب مسلمان تھا۔ اس نے جوگی سے کہا کہ صرف جعفر حاضر ہے۔ جوگی نے پوچھا کوئی ہندو ہے جواب ملا نہیں۔ شکر ناتھ نے تین بار

جوگن ہوواں، دھواں پاواں، تیرے کارن میں مر جاواں
سائیں کارن جوگن ہوواں کریئے جو کجھ سریئے
آیا جوگی، ختم گیا آسن رہی بھبھوت
رمتا رام اتیت

یہی سوال کیا اور تینوں بار نفی میں جواب ملا۔ شکر ناتھ نے جعفر کو اندر اپنے پاس بلایا۔ اس کے سر کے بال کاٹے پھر اپنی ٹوپی اس کے سر پہ رکھی اپنا زنار اور ناد جعفر کو دیا پھر کچھ باطنی تعلیم دی اور اس کو اپنا گدی نشین بنا دیا۔ کہا کہ اے جعفر اب تیرا پنتھ اس فقر میں چلے گا۔۔۔۔۔۔ اب پیر جعفر کے چیلے زیادہ ہونے لگے۔ یہ مسلمان جوگی کہلاتے تھے اور دوسرے جوگی ان کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تھے مگر باقی سب باتوں میں شریک رہتے تھے۔ جعفر شکر ناتھ جوگی کے تیس سال بعد تک زندہ رہا۔ مہاراجہ شیر سنگھ کے زمانے میں میر جعفر کے مکان کے لنگر پر شکر ناتھ کی وصیت کے خلاف لانگری ہندو کی بجائے مسلمان رکھ لیا گیا جس پر ٹلہ بیر کے جوگیوں نے ہلہ بول دیا۔ راجہ شیر سنگھ نے ریاست کے جوگیوں کے علاوہ لاہور کے جوگی طلب کئے اور آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ پیر جعفر جوگی کے مکان پر لانگری شکر ناتھ جوگی کی وصیت کے مطابق ہندو ہی ہوگا ورنہ یہ مکان بھی ٹلہ بیر کے جوگیوں کو مل جائے گا۔ مختصراً یہ کہ مسلمان جوگیوں کا یہ قبیلہ جعفریہ جوگی کہلاتا ہے اور لاہور میں مسلمان جوگی ذات کا ایک بڑا قبیلہ اندرون شہر آباد ہے۔

تحقیقات چشتی میں یہ بھی درج ہے کہ اکبر نے جب کشمیر پہ حملہ کیا تو اس وقت پیر جعفر جوگی موجود تھا جو راجوری کے آس پاس تھا، جبکہ ٹلہ بیر میں جوگیوں کا مٹھ بھی موجود تھا۔ اکبر نے چاہا کہ ٹلہ بیر میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا جائے اور تعمیر کے لیے حکم دے دیا گیا مگر اچانک اس علاقے میں پانی کے چشمے خشک ہو گئے۔ کہتے ہیں ٹلہ بیر کے جوگی نہیں چاہتے تھے کہ یہاں پر قلعہ تعمیر ہو اس لیے انھوں نے دعا کی اور یوں پانی کے سب چشمے اور نالے خشک ہو گئے۔ اکبر نے قلعہ تعمیر کرنے کا خیال ترک کر دیا۔

پنجاب میں جوگیوں کا تعلق مختلف پنتھوں سے رہا ہے۔ بھٹنڈہ کا بابا رتن جوگی بڑی اہم شخصیت رہا اور دارا شکوہ نے باباجی کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور خود ان سے ملا۔ متعدد مسلمان مصنفوں نے بھی ان کا بھی ذکر کیا۔ تاہم بابا گورکھ ناتھ کا پنتھ پنجاب میں زیادہ مقبول رہا۔ علامہ اقبالؒ نے بھرتری ہری کے ایک شعر کا ترجمہ کر کے اسے اردو ادب میں ایک طرح سے زندۂ جاوید

کر دیا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

بھرتری ہری کسی بابا گورکھ ناتھ کا ہم عصر تھا۔ قصّہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ بھرتری ہری ہندوؤں کے مشہور بادشاہ اور بکرماجیتی سنہ کے بانی بکرماجیت کا بھائی تھا۔ صورت یوں ہوئی کہ کسی بددعا کے باعث بکرماجیت معزول ہو کر کسی اور جنم میں آیا۔ بھرتری ہری نے اسے محبوس کر لیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ بھرتری ہری کے حرم میں سولہ سو رانیاں تھیں۔ ان میں سے پنگلہ رانی اسے بڑی محبوب تھی۔

ایک روز بھرتری ہری جنگل میں گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ لوگوں نے ایک مردے کو جلانے کا اہتمام کیا ہے، مردہ چتا میں ڈالا اور چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ایک عورت آئی جس نے اپنا جسم کاٹ کاٹ کر آگ میں ڈالنا شروع کیا اور آخر میں خود بھی چتا میں کود گئی۔ بھرتری ہری کو ستی ہونے کی یہ ادا بہت پسند آئی اور اسے وفاداری یا عشق کی معراج جانا۔ جنگل سے واپس آ کر پنگلہ رانی کو یہ قصّہ سنایا جس نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ "وہ عورت ستی نہ تھی ہٹی تھی۔" راجہ کے پوچھنے پر پنگلہ نے کہا "ستی وہ ہوتی ہے جو شوہر کی موت کی خبر سن کر جان سے گزر جائے۔"

راجہ بھرتری ہری نے پنگلہ کو آزمانے کے لئے ایک منصوبہ بنایا اور غائب ہو گیا۔ پھر پنگلہ کو خبر بھجوائی کہ بھرتری ہری مر گیا.... پنگلہ نے خبر سنی تو اسی وقت جان سے گزر گئی مگر مرتے مرتے کہہ گئی کہ راجہ مرا نہیں اس نے میرا امتحان لیا ہے.... اس کے مرنے پر راجہ حیرت زدہ رہ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ دوبارہ زندہ ہو جائے مگر یہ ممکن نہ تھا۔ درباریوں نے کہا کہ جوگی بابا گورکھ ناتھ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ بھرتری ہری اس کے پاس حاضر ہوا اور کہا پنگلہ کو زندہ کیا جائے۔ گورو گورکھ ناتھ سے یہ ملاقات مرگھٹ کے قریب ہوئی۔ بھرتری ہری ہائے پنگلہ ہائے پنگلہ کر رہا تھا، گورو نے اپنی مٹی کی ہنڈیا توڑ دی اور زور زور سے پکارنا شروع کر دیا "ہائے میری ہنڈیا، ہائے میری ہنڈیا".... بھرتری ہری نے گورو سے کہا کہ ہنڈیا ٹوٹنے پر کیوں چلاتے ہو۔ گورو نے کہا کہ ایسی ہنڈیا لا دو

بھرتری بولا ایسی ہزار ہنڈیا ے دوں گا مگر گورو گورکھ ناتھ نے کہا نہیں یہ ہنڈیا دوبارہ جُڑ جانی چاہیئے اسے جوڑ دو۔۔۔ بھرتری ہری کے لیے یہ ممکن نہ تھا اب گورو نے کہا "بھرتری ہری جو ٹوٹ گئی سو ٹوٹ گئی" تم نے خود پنگلا کو مرجانے پر مجبور کردیا اب وہ دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتی۔

اس مرحلے پر گورکھ ناتھ نے بھرتری ہری سے کہا کہ وہ آنکھیں بند کرے اور پھر کھول لے۔ جب آنکھیں کھلیں تو پنگلا سامنے کھڑی تھی۔۔۔۔ اور اس کی شکل کی کئی اور رانیاں بھی تھیں۔ بھرتری ہری نے حیرت زدہ ہوکر گورو سے کہا کہ اسے اپنا چیلہ بنالیں اور مُردوں کو زندہ کرنے کا اعجاز عنایت کریں۔ گورو نے کہا کہ بہتر ہے تو بادشاہ رہے مگر بھرتری نے کہا کہ میں نے بادشاہی اپنے بھائی بکرماجیت کو دے دی۔ اب مجھے اس سے کوئی علاقہ نہیں۔ بھرتری ہری نے راج پاٹ بکرماجیت کو دیا۔ دونوں بھائی گورو کے پاس حاضر ہوکر کہنے لگے کہ دونوں کو چیلہ کرلیں۔ گورو نے بکرماجیت سے کہا کہ وہ راج کرے۔ اس سے پہلے بھرتری ہری کو آزمانے کے لئے انہیں پنگلا کو زندہ کرنے کے بعد کہا کہ وہ آنکھیں بند کرے جب آنکھیں کھولیں تو پنگلا سمیت سبھی عورتیں غائب تھیں صرف گورو موجود تھے گورو نے بھرتری ہری سے پھر پوچھا کہ کیا وہ اب بھی چیلہ ہونا چاہتا ہے۔ بھرتری نے ہاں کردی۔ یوں گورو گورکھ ناتھ نے بھرتری ہری کو چیلہ کرلیا۔

گورو گورکھ ناتھ خود کیلاش پربت پہ گئے جہاں شیوجی رہتے ہیں اور گورو کے فرمان کے مطابق بھرتری ہری کو حکم ہوا کہ ضلع جہلم میں معروف ٹلہ گورکھ ناتھ (اب ٹلہ بالناتھ) پہ جاکر رہے۔ بھرتری ہری یہیں مقیم رہا۔ یہاں پہاڑ کاٹنے، اٹھانے اور گرانے کا قصہ بھی موضع رسدھ کراتا تک پھیلا ہوا ہے۔ ٹلہ بالناتھ اور رسدھ کراتا دونوں جوگیوں کے استھان تھے۔

شیوجی نے جوگیوں کے لئے جو راہ عمل یا طریق وضع کیا وہ یوں ہے کہ گورکھ ناتھ کو حکم دیا کہ:

(۱) جوگی جتی رہے گا یعنی شادی نہیں کرے گا، اس کے چیلے ہی اس کی اولاد ہوں گے۔

(۲) جوگی زنار پہنے گا۔ سنکھ ساتھ رکھے گا جو بجاکر شبد شیو گورو نکالے گا۔

(۳) شیوجی کی بیوی پاربتی نے اپنے ناخن سے گورکھ ناتھ کے کان چھیدے اور مٹی کی بالیاں پہنائیں یوں کان چھیدنا اور بالیاں پہننا لازم ہوا۔

(۴) پاربتی نے اپنا زانو چیرا جو لہو نکلا اس سے کپڑا تر کیا اور کہا کہ جوگی اس رنگ کے کپڑے پہنیں گے۔

(۵) ہندوؤں میں مُردوں کو جلاتے ہیں، جوگی کو مرنے پر دفن کیا جائے مگر وہ چار زانو ہو۔ قبر کے اوپر مڑھی کا نشان بنایا جائے۔

شاہ حسین نے اگر جوگیوں کی شعبدہ بازی کو ناپسند کیا تو کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جو ان میں اور شاہ حسین میں اتفاقیہ یا بالارادہ مشترک ہوگئیں۔ شاہ حسین نے شادی نہیں کی، مرید یا چیلے بنائے مگر مولانا حکیم کو مرید نہیں بنایا۔ سنکھ نہیں بجایا مگر ڈھول کی تھاپ پر ناچ بھی کیا، شاعری کی اور خود گا کر مزا لیا۔ موسیقی سے ایسا تعلق تھا کہ کلاسیکل راگوں، راگنیوں میں کافیاں کہیں اور انہیں گایا۔۔۔ کان نہیں چھیدے مگر مسجد اور مکتب سے نکلے تو پھر ساری عمر سُرخ کپڑے پہنے۔

معتقد اور ہم مجلس

دارا شکوہ اور بعد کے مصنفین شاہ حسین کے ماننے والوں کا بھی ذکر کرتے ہیں اور ان کے مریدان باصفا کا بھی۔ ہم اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے تاہم ان سے صرف نظر کرنا بھی حسین کی زندگی کے ایک پہلو کو اندھیرے میں رکھنے کے مترادف ہے اس لئے حقیقت الفقراء کے دو مختلف ابواب میں جس طور سے ان کا ذکر آیا ہے اسی انداز میں پیش کرتے ہیں۔

روز و شب شاہزادہ شاہ سلیم — داشت در راہِ او سرِ تسلیم
ہم شاہ دانیال و شاہ مراد — بودہ اند، از محبتِ او شاد
ہمہ خواتینِ پردۂ عصمت — داشتندے عزیز از عزت
ناظر شاہ خواجہ دولت خان — بود خدمت پرستِ او از جان
شیخ ابوالفضل بود مخلصِ او — بودے از ہمتش کشائش جو
پسرش شیخ عبد رحمان نام — خادمش بود از نیاز تمام
خانِ خاناں و خان اعظم ہم — مے زدند از ارادتِ او دم
جعفراں آصفِ شہِ جم جاہ — پیشِ او داشتہ ست سر در راہ

پیشِ او زین خان کوکلتاش | بود ناشے زمہر پے پرخاش
بود شہباز خان ہم از ایشان | بندہ اش با تمام کمبوہان
نیز بر سر بخاک درگاہش | تان سین او فتادہ در راہش

حسین کے دوستانِ بااخلاص میں سے جنہیں شامل کیا گیا ہے ان کا تذکرہ یوں ہے۔

ہم رقاص و اہلِ وجد و سماع | کردہ اند ہرچہ خود خداست وداع
بود محبوب جانبش مادھو | عمدۂ دوستانش شیخ صدو
شوقی و ہم جمالی و غالب جنگ | در رہِ دوستی باو یک رنگ
ہردو شعبان و ہردو ابراہیم | داشتہ در رہش سرِ تسلیم
بود ملا محمد و آبو | نیز دیوان جیو مخلصِ او
شیخ یعقوب مرد راست و درست | آنکہ اکسیر ساز بود نخست
بود دیگر بہار خان منڈھ | از وفاو محبتش بندہ
بابو ڈھڈیِ از محبانش | فتح سامی محب از جانش
حاجی آں مخلص خدائے ودود | کز حیثش خطاب بابا بود
نیز عبد السلام دانشمند | کز دانش بفقر شد خرسند
ہم ز یارانِ او شہاب الدین | کالو و باز صالح و لیین
دیگر آں مدوئے رباب نواز | پیشِ او مے نواختے خوش ساز

محمد پیر لکھتا ہے کہ اب (۱۰۱۷ھ) ان میں سے شیخ صدو کے سوا سبھی سرائے فانی سے گزر گئے۔ شیخ صدو افغانوں کے قصور میں اپنے فقیر ساتھیوں کے ساتھ سرخوش و سرمست ہے۔

سفر

شاعر

لاہور سے باہر

جب حکم حضوری آ پہنچا

مزارِ حسین

شاعر...اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

شاہ حسین کے عالم فاضل ہونے کے بارے میں کسی کو اختلاف نہیں اور شیخ الاسلام عبداللہ سلطان پوری جیسے علاّمہ کے سامنے مکالمہ کرنے کے لئے مکتب خانہ چلے جانا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ انہیں اپنے علم و فضل پر پورا اعتماد تھا۔ اگر شہزادہ سلیم سے متعلق یہ روایت بھی تسلیم کر لی جائے کہ اس نے اپنے ایک عالم اہل کار بہار خان کو حسین کی گفتگو اور روزنامچہ کے لئے مامور کیا تھا تو تصدیق ہوتی ہے کہ حسین کی باتوں میں یقیناً گلوں کی خوشبو بھی ہوگی اور دانش کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک بھی...۔ دارا شکوہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے: "قرآن کا حافظ تھا اور آیتوں کے عجیب و غریب معانی بیان کرتا تھا۔ تمام دن میں ایک مرتبہ قرآن ختم کر لیا کرتا تھا۔"

مذہبی علوم کے علاوہ شاہ حسین کی شعر و ادب سے دلچسپی کا ایک واقعہ بھی دارا شکوہ نے ہی بیان کیا ہے۔ "حسنات العارفین" میں لکھتا ہے: "شیخ حسین ڈاہڈا اس مجلس میں کہ دیوانِ حافظ حاضر تھا، آئے۔ پوچھا کہ یہ کون سی کتاب ہے۔ لوگوں نے کہا دیوان حافظ۔ کتاب کو کھولا یہ غزل نکلی کہ یہ بیت اس میں ہے،

چشمۂ چشم مرا اے گلِ خنداں دریاب
کہ باُمیدِ تو خوش آب روانے دارد

کتاب کو زمین پر مارا اور کہا "حافظ بھی بوڑھی عورتوں کی طرح روتا ہوا مر گیا۔" اس قصے پر ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کا تبصرہ ہے "آپ جانتے ہیں کہ حافظ کے متعلق یہ رائے قطعاً نادرست ہے کیوں کہ حافظ کے اشعار کا ایک بڑا حصہ سرخوشی، مسرت اور وفورِ حیات کے جذبات سے بریز ہے الٹا یہ شخ نکلا کہ حسین جو سالہا سال لہو و لعب کا رسمی سُرخ پیراہن پہنے پھرتا رہا ایک بھی نشاط آہنگ شعر نہ کہہ سکا۔"

ہم نہیں کہہ سکتے کہ حافظ کے بارے میں شاہ حسین یا علامہ اقبال کی آرا درست تھیں یا نہیں مگر وہ یقیناً ایک مخصوص ذہنی اور رجالی کیفیت کی ترجمان ضرور تھیں۔ دارا شکوہ کو جو حسین ڈاڈھا نظر آیا وہ اپنی شاعری میں 'نمانا' اور فقیر نظر آتا ہے۔ یہ دو مختلف عکس ایک ہی شخصیت کے ہیں اور شاید اپنے بعد بھی حسین کو ان دو متضاد یا متصادم کیفیات کی بنا پر ہی اتنا پسند کیا گیا۔۔۔۔۔۔لیکن ہمیں متذکرہ واقعہ کے حوالے سے یہ عرض کرنا ہے کہ حسین اپنے عہد میں دانش وروں اور سرکار کی زبان کی ادبی روایات سے بخوبی واقف تھا اور نور احمد چشتی نے لکھا ہے کہ حسین فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ چشتی سے پہلے کے تذکرہ نگاروں نے حسین کی فارسی شاعری کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ ان کی مخصوص دانش اور لفظوں کی تعبیر کا ذکر ضرور کیا ہے۔ مثلاً حقیقت الفقرا میں لکھا ہے کہ حسین کی نظر میں لفظ فقر کا مفہوم یوں تھا۔

ف۔ اس سے مراد فقر و فاقہ و فنا۔ فرائض حق ادا کرنا اور فسق و فجور کو ترک کرنا۔

قاف۔ قناعت، قصد اور قربِ حق۔

رے۔ ریاضت، رضا اور روئے دل غیرِ خدا سے پھیرنا۔

چشتی نے حسین کے مزار کے سجادہ نشین کے پاس جو بیاض دیکھی اور جس کے بارے میں دعوے کیا گیا کہ یہ حسین ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی اس میں درویش کے حرفوں کی جو تفسیر یا مفہوم لکھا

گیا اس کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

دال ۔ دردِ دل

رے ۔ ریاضت، ترک ریا کو چھوڑنا۔ غیر حق سے رخصت۔

و۔ وحدت، وداع وجود اور واصل بحق۔

یے ۔ یقین ہونا۔ امید اختیار کرنا۔ یاری کا غیر حق سے نہ چاہنا۔ یاد حق کے سوا دم نہ مارنا اور یک رنگ و یک دل رہنا۔

شین ۔ شکر حق ادا کرنا، شکایت سے لب بند رکھنا اور خدا سے شرم رکھنا۔

سجادہ نشین نے نور احمد چشتی کو ایک اور بیاض دکھائی "ان میں چند ابیات تصنیفات حضرت مرحوم کے تھے ۔ چونکہ کسی بے علم کی لکھی ہوئی ہیں اور ادبا" صحیح کرنا بذریعہ عقل مناسب نہ تھا لہٰذا ایک ایک شعر ان کا درج ذیل ہے۔

فاتح ابواب منم　　صاحب اصحاب منم
جاعل ظلمات منم　　ہادیٔ سیلاب منم
ہرچہ توئی آں منیم

چوں مے خوشم دلدار شد　　عالم ہمہ گلزار شد

شاہدے خود را چوں دیدم مست مست
تا لبِ لعلش رسیدم مست مست

ماہمہ دردیم و درماں نیز هم
بادہ صافی ایم و مستاں نیز هم

پروفیسر محمد اقبال مجددی نے ۱۹۷۲ء میں ایک مختصر سا فارسی رسالہ دریافت کیا تھا جس کا عنوان 'تہنیت' ہے۔ پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ اس رسالے کے اب تک صرف دو خطی نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔

(۱) خطی نسخہ مخزونہ کتب خانہ پیر حیاتیاں والا نوشاہی رسول نگر، سال کتابت ندارد قدیم الخط۔

(۲) دوسرا خطی نسخہ مملوکہ مولانا سید شرافت نوشاہی ساکن ساہن پال گجرات۔ مکتوبہ ۱۳۴۷ھ بخط مولانا شرافت نوشاہی۔ یہ نسخہ مذکورہ خطی نسخہ رسول نگر کی نقل ہے۔ اس رسالہ میں حسین نے اپنا نام حسین لاہوری لکھا ہے۔ قرآن کی بتیس آیات کا حوالہ دیا گیا ہے سات باب ہیں، جن میں پہلے چار کا عنوان دیا گیا ہے۔

فصل اوّل۔ در ترک اقربا و دوستیٔ ایشاں

فصل دوم۔ در طلب مال و ترک آں

فصل سوم۔ در گرفتن ہادی

فصل چہارم۔ در بیان فوائد

فارسی کا ایک پورا شعر ۔۔۔ اور ایک مصرع بھی درج کیا گیا ہے۔

خورش دہ بہ کنجشک و کبک و حمام
کہ یک روزت افتد ہمائے بدام
ہوا خواہاں کوشش راچوں جانِ خویشتن دارم

شاہ حسین سے یہ رسالہ ۱۹۷۲ء سے پہلے کسی نے منسوب نہیں کیا اور نہ کہیں اس کا حوالہ ملتا ہے۔ محمد پیر (حقیقت الفقراء) سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ چونکہ وہ حسین کے دوبارہ دفن کے وقت تیرہ برس کا تھا اور پھر تقریباً چھتیس برس تک مادھو لال کا مرید رہا اس لئے اس نے خود یہ رسالہ دیکھا ہوگا۔ مگر اس نے اس کا ذکر نہیں کیا۔۔۔ لیکن اس حساب سے ہم یہ بھی نہیں کہہ

سکتے کہ اس رسالہ کا مصنف حسین کو تسلیم نہ کیا جائے کیونکہ محمد پیر نے حسین کی پنجابی شاعری کا بھی کہیں ذکر نہیں کیا۔ البتہ اس کی تصنیف کے چند برس بعد لکھی گئی کتاب مفتاح العارفین میں حسین کی پنجابی شاعری کی تصدیق کی گئی ہے۔

حسین کے رسالہ تہنیت کے بارے میں مرحوم ڈاکٹر نذیر احمد نے لکھا ہے "رسالہ تہنیت میں..... شاہ حسین طریقت کی منزلوں کا بیان کرتے ہیں۔ رسالہ کا مضمون اوسط سطح کا ہے لیکن کم از کم اتنا معقول اور مربوط ہے کہ کسی مجذوب کا کلام نہیں ہو سکتا مگر یہ کہیں نہیں پتا لگتا کہ یہ رسالہ حسین نے اپنے دورِ مجذوبیت سے پہلے لکھا تھا یا بعد..... اگر بعد میں لکھا ہے تو شرع کی طرف لوٹ آنے کی بات باور کی جا سکتی ہے، اگر پہلے لکھا ہے تو اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا...."

لاہور سے باہر کا سفر

شاہ حسین کے لاہور سے باہر سفر کرنے کا تذکرہ حقیقت الفقراء میں صرف اس قدر ہے کہ وہ شاہدرہ تک جایا کرتے تھے۔ ایک بار اس سے آگے شرق پور کی طرف منڈیاں والا گئے جہاں کا زمیندار بہار خان ان کا مرید ہو گیا۔ یہ سفر بھی انہوں نے اپنے درویشوں کے ساتھ کیا تھا، مگر نور احمد چشتی نے لکھا ہے کہ جب شاہ حسین کی مجذوبانہ یا غیر شرعی کیفیت کا علم اکبر بادشاہ کو ہوا تو اس نے انہیں دہلی میں طلب کیا۔ لاہور کے کوتوال علی ملک کو حکم ملا کہ حسین کو گرفتار کر کے دہلی بھیجا جائے۔ حسین کو گرفتار کر کے دہلی بھیجا گیا اور دہلی میں اکبر اور حسین کے درمیان مکالمہ بھی ہوا۔ اس نے حسین کی کرامت بھی دیکھی، اکبر کے حرم کی عورتیں بھی حسین کی عقیدت مند ہوئیں۔ چشتی نے حسین کے دہلی تک کے سفر کی شہادت کوئی نہیں پیش کی۔ عین ممکن ہے کہ رسالہ بہاریہ میں یہ بات درج ہو کیونکہ چشتی نے بہاریہ اور حقیقت الفقراء کے بیانات کو کئی جگہ گڈمڈ کر دیا ہے۔۔۔ بابو پورہ (باغبانپورہ) میں حسین کو دفن کرتے وقت وہاں پہ مقیم جوگیوں سے جو مکالمہ ہوا اس کا ذکر بھی حقیقت الفقراء میں نہیں ہے اور نہ ہی اسلام قبول کرنے والے جوگی کا اس میں تذکرہ ہے۔ اس لئے دہلی تک حسین کے سفر کی بات ہوائی لگتی ہے۔

دوسرے سفر کی تفصیل عین الحق فرید کوٹی نے بیان کی ہے۔ یہ سفر امرتسر تک تھا۔ وہ پنجابی کے تحقیقی رسالہ "کھوج" لاہور نمبر ۱۲۔ ۱۱ میں لکھتے ہیں۔

"شاہ حسین کے بارے میں گوربلاس کا مولف بیان کرتا ہے کہ جب گورو ارجن دیو (۱۵۶۳ ۔ ۱۶۰۶ء) امرتسر میں گرنتھ صاحب ترتیب دے رہے تھے اس زمانے میں لاہور میں کاہنا بھگت، چھجو بھگت، پیلو بھگت اور شاہ حسین موجود تھے۔ گورو ارجن دیو کا چرچا سن کر یہ چاروں درویش اکٹھے ہو کر ان سے ملنے امرتسر گئے۔ اس زمانے میں وہاں ایک بہت بڑا تالاب تھا اس لئے اس کا نام "سرووَر" تھا۔ گوربلاس میں ان درویشوں کے سفر کی روداد یوں لکھی گئی ہے۔

"سدھا سرو ور چلیں نہاری (وہ منہ اندھیرے سرو ور کو روانہ ہوئے)

امرتسر میں گورو ارجن دیو نے ان سے کہا "بڈ کرپا ہم پر کری، دیئو درس ایہہ وار" (آپ نے آج مجھے اپنے درشن دے کر بڑا کرم کیا ہے) گورو نے تمام بھگتوں سے باری باری ان کا کلام سُنا۔ جب شاہ حسین کی باری آئی تو انہوں نے اپنی یہ کافی سنائی۔ گوربلاس کے لفظ ہیں۔

شاہ حسین تب کیا سناوے   بولن دی ایتھے جا نا ہے

چُپ وے اڑیا چپ کر جاوے

(تب شاہ حسین نے کہا کہ یہاں بولنے کی مجال نہیں

اس لئے اے دل خاموش ہو جا)

سکھوں سے شاہ حسین کا دو طرح کا تعلق ہے ایک تو یہ کہ جس سال حسین پیدا ہوتے اسی سال (۱۵۳۸ء) سکھ مذہب کے بانی بابا نانک کا انتقال ہوا۔ وہ صوفیوں کی طرح مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں مقبول تھے۔

بھگت کبیر سے لے کر نانک تک بھگتی کی تحریک بہت نمایاں تھی اور شاہ حسین تک بھی فکری اور لسانی اعتبار سے اس کا اثر آیا تھا۔ بابا نانک نہ صرف خود پنجابی کے شاعر تھے بلکہ انہوں نے

بابا فرید گنج شکر کے مزار پہ حاضری بھی دی اوران کے کلام (دوہے) کو بھی محفوظ کیا۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ پنجابی زبان وادب میں نوے فی صد سے زائد حصہ مسلمان صوفیوں اور شاعروں کا تھا مگر سکہ بند مسلمان دانشوروں اور ادیبوں نے اپنے عہد حکومت میں بھی مقامی زبانوں کے شعروادب کو لائق توجہ نہیں گردانا بلکہ اس کا ذکر تک کرنا کسرِشان جانا۔ سکھوں نے اگرچہ اپنے عہد حکومت میں فارسی ہی کو سرکاری زبان رکھا مگر غیر سرکاری طور پہ پنجابی استعمال ہوتی رہی۔ تاہم پنجابی کسی نہ کسی طور سکھوں کی مذہبی زبان بن گئی اور انگریزوں کے عہد میں اس کے فروغ کے لئے حکومت نے بھی اور سکھوں نے بھی خاصا اہتمام کیا۔ پنجابی شعروادب اور صوفیا سے لسانی اور ادبی رشتہ سکھوں نے استوار کیا۔ اس عمل میں بعض اوقات مبالغہ تک بات پہنچ گئی اور شاہ حسین کے سفرِ امرتسر کی داستان بھی اسی کا حصہ نظر آتی ہے۔ شاہ حسین شاعر ضرور تھے۔ مگر ان کے لئے نہ اپنی شاعری کی کوئی اہمیت تھی اور نہ اپنی ذات کی۔ اس لئے محض اس خیال سے امرتسر جانا کہ ان کی شاعری کو گورو ارجن دیو گرنتھ صاحب میں شامل کرلیں شاہ حسین کے مزاج سے لگا نہیں کھاتا۔ یہاں اس بات سے انکار مقصود نہیں کہ ان کا بھگتوں سے میل ملاپ نہ تھا یا یہ کہ بھگت ان کی عظمت سے آگاہ نہ تھے۔ جہاں تک چھجو بھگت کا تعلق ہے کنہیا لال "تاریخ لاہور" میں لکھتا ہے کہ چھجو کی "میاں میر بالا پیر لاہوری و شاہ بلاول لاہوری اور شیخ اسمٰعیل المشہور میاں وڈا وغیرہ بزرگان خدا پرست کے ساتھ کمال دوستی تھی۔" یہ ممکن ہے کیونکہ چھجو ان کا جونیئر ہم عصر تھا۔ مگر شاہ حسین چھجو بھگت سے عمر میں خاصے بڑے تھے۔ چھجو بھگت شاہ حسین کے مرنے کے چالیس سال بعد تک زندہ رہا۔ گویا وہ مادھو کا ہم عصر تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ حسین اور چھجو بھگت میں سرراہے قسم کے تعلقات تو ہوسکتے ہیں مگر ایسے تعلقات نہیں ہوسکتے کہ وہ انہیں امرتسر تک ساتھ لے جائے۔ اگر گورو ارجن دیو سے ملاقات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ شاہ حسین کی وفات سے کم و بیش دس سال پہلے ہونی چاہیئے۔ یعنی ۱۵۹۰ء کے قریب اس وقت گورو کی عمر تائیس برس کے

قریب ہونی چاہیئے۔ شاہ حسین عمر میں گورو سے پچیس برس بڑے تھے۔ عام روایت کے مطابق عمر میں اتنے فرق کے باعث قیاس یہی کہتا ہے کہ شاہ حسین نے گورو کے پاس حاضری نہیں دی ہوگی۔

غیر مسلموں میں سے شاہ حسین کا تعلق صرف مادھو سے رہا اور وہ بھی یوں کہ مادھو نے حلقۂ عقیدت میں آنے کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ ایک دلیل بھی گورو اور حسین کی امرتسر میں ملاقات کے خلاف جاتی ہے۔ لاجونتی رام کرشن نے "پنجابی صوفی پوئٹس" میں بابا بُدھ سنگھ کی اس بات کو رد کر دیا ہے کہ گورو ارجن دیو نے حسین کا کلام گرنتھ صاحب میں شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہ کہ کلام خود شاہ حسین نے پیش کیا تھا۔ لاجونتی کا کہنا ہے کہ حسین کی شاعری گرنتھ میں شامل کی گئی بہت سی شاعری کے مقابلے کی ہے۔ دوسرے یہ کہ شاہ حسین جیسے آزاد منش صوفی کو اس بات کی قطعی کوئی پرواہ نہ تھی کہ ایک فرقہ (اس وقت ایک غیر معروف) اپنی مذہبی کتاب میں اس کی شاعری کو شامل کرتا ہے کہ نہیں۔

متذکرہ بالا کوائف کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ شاہ حسین نے لاہور سے باہر کوئی سفر نہیں کیا۔

جب حکم حضوری آپہنچا

شاہ حسین کی وفات کے بارے میں ایک بیان حقیقت الفقراء کے محمد پیر کا ہے اور دوسرا شاہ حسین کے ہم عصر ملا عبدالقادر بدایونی کا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے نجات الرشید (۱۰۰۴ھ) میں لکھا ہے:

"در زمانِ تالیف ایں رسالہ ببلدۂ لاہور فقیرے حسین نام کہ کسب جامہ بافی داشت ترک کاروبارِ خود کردہ درمیان فقراء بود۔ و با یکے متمولان درویش دوست آمد و رفت داشت۔ اتفاقاً در خانۂ آں مالدار کنیزکے سرود گوئے۔ زیبا جمالے بود۔ و گاہے گاہے صاحبش آں فقیر را درونِ خانہ مے برد و آں پردگی را مے گفت تا پیش او چیزے بگوئید۔ روزے جاریہ سرودے بآواز خوش بنیاد کرد و درویش را وجد شد و حال ورزید تا از بالائے خانہ بلند بیفتاد و جان بجاناں داد۔ صاحبِ شرع خود ایں اداراں نمے پسندد و عنداللہ چگونہ باشد؛ نظم

سرود و عاشقی چوں شد بہم یار معاذ اللہ بہ رسوائی کشد کار

سرود عاشقی و مے پرستی سبب شد ہر سہ چیز از بہر مستی

موت کی اگر یہ صورت ہوتی تو ممکن ہے اس کا ذکر دارا شکوہ بھی کرتا، اس سے پہلے

جہانگیر کا نامزد روزنامچہ نویس بہار خان بھی یہی حال بتاتا اور محمد پیر کے لئے پھر ممکن نہ تھا کہ وہ یہ تفصیل بیان کر سکتا کہ:

"جب شاہ حسین کی عمر تریسٹھ برس ہوئی تو ایک روز (جمعہ جمادی الثانی ۱۰۰۸ھ) حسب روایت وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر شہر سے باہر نکلے۔ کشتی میں سوار ہو کر شاہدرہ کی طرف رُخ کیا۔ دریا کے عین بیچ انہیں ریگستان یا ریتہ نظر آیا، وہیں اُتر گئے ان کے ساتھی بھی ہمراہ تھے۔ ریتے پر جا کر حسین نے تیر و کمان سے طبیعت کو بہلانا شروع کیا۔ ریت پر ایک نشانہ رکھ کر چند تیر چلائے اور پھر ساتھیوں سے کہنے لگے۔ دوستو! جب کوئی حقیقی دوست اپنے دوست کو اپنی طرف بلائے تو پھر بسر و چشم حاضر ہونا چاہیئے۔ یہ سُن کر شاہ حسین نے کہا۔ اللہ نے طلب فرمایا ہے۔ ریت پر چادر بچھائی اس پر لیٹ گئے اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

وقتِ جاں دادن از دلش ناگاہ　　　نالہ آمد برون کہ حق اللہ

چوں حق اللہ گفت جاں بسپرد　　　بادۂ صاف وصل اللہ خورد

خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ شاید ہی کوئی آنکھ تھی جو نم نہ ہوئی ہو گی۔ مغل شاہوں کے محلوں میں ماتم تھا، بے کس و بے نوا لوگوں میں ماتم تھا۔

کہے حسین فقیر نمانا، ہتر ہوئے اُداسی

(عاجز فقیر حسین کہتا ہے میرے لوگ اُداس ہو گئے ہیں)

حسین کی وصیت کے مطابق تجہیز و تکفین کا انتظام وہیں کیا گیا اور دریا کے دوسرے کنارے شاہدرہ کے پاس خود حسین کی منتخب کردہ جگہ پر انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ جگہ بھی باغ نما تھی، یہاں ایک کنواں بھی کھدوایا گیا تھا، درختوں کے جھنڈ بھی تھے، مگر شاہ حسین کی وصیت کے مطابق اس قبر میں انہیں صرف تیرہ برس رہنا تھا۔ ایک سال مادھو اس قبر پر مقیم رہا۔ غم سے نڈھال مادھو کے لئے کوئی دوسرا ٹھکانا نہ تھا۔ مگر محبوب نے اس کے گھر کے قریب دفن ہونے کی خواہش کی تھی، یہ خواہش پوری ہوئی۔۔۔۔ ایک برس بعد مادھو کو حکم ہوا کہ وہ پھر راجہ

مان سنگھ کی نوکری پر چلا جائے۔

شاہ حسین کو وفات پائے تیرہ برس گزرے تھے کہ راوی میں زبردست سیلاب آیا۔ اس سیلاب سے حسین کی قبر کو خطرہ لاحق ہوا۔ شاہ حسین یہ پیش گوئی بھی کر گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ انہیں تیرہ برس بعد بابو پورہ میں (موجودہ مزار کی جگہ) دفن کیا جائے۔ جب سیلاب قبر تک آ گیا تو دوستوں نے قبر میں شگاف ڈالا جب قبر کو کھولا تو درمیان میں سے خالی تھی نہ لاش تھی نہ خاک نہ ہڈیاں۔۔۔۔ سب حیران ہوئے پریشان ہو کر لوٹے ہی تھے کہ قبر سے شعلۂ نور بلند ہوا سب واپس آئے ان سے ایک مرید محمد صالح کو اشارہ ہوا کہ قبر کے اندر جا کر دیکھو۔ محمد صالح قبر کے اندر گیا دیکھا گل ریحان کا ایک گلدستہ ایک طرف لٹک رہا ہے اس وقت اس کے کان میں شاہ حسین کی آشنا آواز آئی۔ قدرت الٰہی سے میرا جسم گلدستہ بن گیا ہے، یہی گلدستہ ہماری نعش ہے اسی کو لے جاؤ، مگر اسے کوئی نہ سونگھے اور یہ راز کسی پر ظاہر بھی نہ ہو۔۔۔۔ اسے فوراً بابو پورہ میں دفن کرو۔ جس کو میرے دیکھنے کی خواہش ہو وہ مادھو کو دیکھے جو اسی سال بابو پورہ میں پہنچ جائے گا۔۔۔ محمد صالح اور دوسرے لوگوں نے جنازے کی صورت یہ گلدستہ بابو پورہ میں دفن کیا۔

شُد گِلِ گور گُل ز نورِ حسین

(قبر کی مٹی حسین کے نور سے پھول بن گئی)

چار سو ایک برس (۱۴۰۹–۱۰۰۸ھ) سے شاہ حسین اس مٹی کے ساتھ مٹی ہو کر بھی زندہ و تابندہ ہیں جس کے بارے میں انہوں نے بار بار کہا:

کہے حسین فقیر نشا کے اساں خاک دے نال سماونا

کہے حسین فقیر سائیں دا انت خاک وچ رلنا

کہے حسین فقیر نمانا   آخر خاک سماؤ مے

کہے حسین فقیر نمانا   آخر خاک سمان

شاہ حسین فقیر سائیں دا   جنگل جائے سمادن

مزارِ حسین ۔۔۔ جہاں شاہوں کا سر خم تھا

مغل بادشاہوں اور شہزادوں میں سے دارا شکوہ پہلا شخص ہے جس نے براہِ راست شاہ حسین کا ذکر کیا اور انہیں اہلِ ملامت کا امام کہا ورنہ مغل ریکارڈ شاہ حسین کے بارے میں زیادہ تر خاموش ہے ممکن ہے کہ یہ خاموش نہ ہو ابھی وہ پورا سامنے بھی نہ آیا ہو اور جو آیا ہے اسے اس نکتہ نظر سے دیکھا ہی نہ گیا ہو لیکن یہ تشنگی شاہ حسین کے بارے میں ہی محسوس نہیں ہوتی۔

بے شمار نامور صوفیا، علماء اور اساتذہ کے بارے میں بھی محسوس ہوتی ہے ۔۔۔ کچھ یوں بھی ہے کہ مختلف یلغاروں اور قتل و غارت گری میں کاغذات بھی کھو گئے اور کاغذات کے مالک بھی۔ مثلاً نور احمد چشتی نے لکھا ہے کہ شاہ حسین کی خانقاہ کے لئے اکبر اور جہانگیر کے عہد میں کچھ اراضی دی گئی مگر نادر شاہ کی یلغار کے دوران یہ کاغذات تلف ہو گئے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر اس مقصد کے لئے مغلوں کے اس دور کا وہ ریکارڈ بھی دیکھنا چاہیئے جو فی الحال سامنے نہیں آیا مگر اس کی موجودگی کے شواہد ملتے ہیں۔ یہ ریکارڈ دونوں ملکوں پاکستان اور بھارت خصوصاً بھارت میں ہے۔

جہاں تک مطبوعہ کتابوں کا تعلق ہے محمد صالح کنبوہ نے شاہ جہاں کے عہد کی جو تاریخ شاہجہان نامہ / عمل صالح) لکھی ہے اس میں ایک مقام پر حسین کا ذکر ملتا ہے ۔۔۔ شاہ جہاں نے غالباً ۱۰۵۰ھ

میں لاہور کے گورنر علی مردان خان کو دریائے راوی سے لاہور تک ایک نہر نکالنے کا حکم دیا تھا۔ علی مردان نے ایک لاکھ کے خرچ سے جب یہ نہر نکال لی اور یہ لاہور کے نواح میں آ گئی تو حکم ہوا کہ یہاں نشیب و فراز والا ایسا قطعہ تلاش کریں جہاں باغ لگایا جا سکے اور اس میں آبشاروں، نہروں اور حوضوں کا بندوبست ہو سکے۔ انجنیئر خلیل اللہ نے اس جگہ کا انتخاب کر لیا۔ محمد صالح لکھتا ہے "یہ جگہ حسین ڈاڈھہ کے مکان کے پاس تھی۔"

شالامار باغ اور شاہ حسین کے مزار کے وقوع کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مغل شہنشاہ شاہجہان کے ہاں بھی شاہ حسین کی تقریباً اتنی ہی عظمت تسلیم کی جاتی تھی جس کا اعتراف دارا شکوہ نے کیا ہے یا اکبر اور جہانگیر سے منسوب کی جاتی ہے۔ اگر شاہ حسین کا مزار نواح میں نہ ہوتا تو عین ممکن تھا کہ شالامار کو مغرب کی طرف مزار والی جگہ تک پھیلا دیا جاتا مگر حسین کے مزار کے تقدس نے دیوارِ گلستان کو روک لیا۔

نور احمد چشتی نے لکھا ہے "جب معز الدین بن جہاندار شاہ تخت نشین حکومتِ ہندوستان ہوا اور پھر حسب خرخشہ برادران حکومت سے خارج ہو کر لاہور میں بمزار حضرت حسین مشرف ہوا تو اس نے حضرت کی جناب میں نذر مانی کہ اگر اللہ تعالےٰ نے مجھے تخت بادشاہی پھر عطا کیا تو میں حضرت کے مزار پر سائبان بچوب ہائے طلائی و دو دیگ پُر از روپیہ و اشرفی نذر چڑھاؤں۔ جب بامداد حضرت وہ دوبارہ تخت نشین ہوا تو اس نے ادائے نذر کی تو حضرت رنگ بلاول صاحب نے حضرت کی خانقاہ پر عمارت تعمیر کرائی۔"

معز الدین کا لقب جہاندار شاہ وہ بہادر شاہ کا بیٹا تھا جو ۲۷ فروری ۱۷۱۲ء کو لاہور میں انتقال کر گیا۔ اس کے چاروں بیٹے معز الدین، عظیم الشان، رفیع الشان اور شاہ جہاں یا جہان شاہ بہادر شاہ کی موت کے فوراً بعد لاہور میں ہی تخت نشینی کی جنگ شروع ہوئی۔ معز الدین، رفیع الشان اور شاہجہان نے عظیم الشان کو جو سب بھائیوں میں لائق خیال کیا جاتا تھا اور جس کے پاس کچھ وسائل بھی تھے ہٹانے کے لئے متحدہ محاذ بنا لیا۔ دراصل اس زمانے میں مختلف امراء اس قدر طاقت ور

ہو چکے تھے کہ شہزادے ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئے تھے۔ تخت نشینی کی اس خوفناک جنگ میں شہر میں امن وامان بالکل تباہ ہو گیا۔ بہرحال عظیم الشان خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا تا آنکہ تینوں شہزادوں نے عظیم الشان کے کیمپ کا محاصرہ کر لیا۔ خوفناک جنگ ہوئی۔ عظیم الشان کے ہاتھی کو توپ کا گولہ لگا وہ بھاگا دریائے راوی میں گرا اور عظیم الشان سمیت دلدل میں دھنس گیا۔۔۔۔ عظیم الشان راہ سے ہٹ گیا۔ اب معزالدین اور جہان شاہ میں لڑائی ہوئی۔ معزالدین جہاندار شاہ کو شکست ہوئی وہ بھاگ گیا مگر جہان شاہ گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ تیسرا بھائی رفیع الشان دونوں کی لڑائی میں غیر جانبدار تھا اس نے معزالدین جہاندار شاہ پر حملہ کر دیا۔ رفیع الشان بھی ہلاک ہو گیا۔ ان تین بھائیوں کا خاتمہ صرف ایک مہینے کے اندر اندر ہوا اور چوتھا معزالدین جہاں دار شاہ تخت نشین ہوا۔

آثار وقرائن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے ہونے کے ناطے معزالدین جہاندار شاہ خود کو تخت کا وارث سمجھتا تھا مگر باپ کی زندگی میں شاید وہ سب سے بے اثر اور بے وسیلہ شہزادہ تھا، باپ کے مرنے کے بعد وہ تینوں بھائیوں کا سربراہ ہوا مگر درحقیقت چاروں خود کو تخت کا وارث سمجھتے تھے اس لئے ایک ایک کر کے تین کا خاتمہ ہوا۔ جب تخت کی لڑائی دوسرے مرحلے پر تھی اور جہان شاہ کے ہاتھوں جہاندار شاہ کو شکست ہوئی غالباً اس مختصر سے عرصے میں معزالدین جہاندار شاہ نے لاہور کے مشرقی علاقے میں پناہ حاصل کی اور اس اثنا میں وہ شاہ حسین کے مزار پر حاضر ہوا ہوگا تینوں بھائیوں کے خاتمے کے بعد جو اس عہد کے سیاسی حالات کے مطابق ایک قدرتی امر تھا معزالدین جہاندار شاہ نے اسے شاہ حسین کا فیض سمجھتے ہوئے ان کے مزار کی مرمت یا تعمیر کرائی ہوگی۔

ویسے معزالدین ۲۲ جون ۱۷۱۲ء/ ۱۱۲۴ھ کو لاہور سے دہلی پہنچا اور اگلے سال ۱۱ فروری ۱۷۱۳ء کو فرخ سیر کے حکم سے قتل ہوا جو عظیم الشان کا بیٹا تھا اور جس نے اپریل ۱۷۱۲ء میں اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ معزالدین کی دہلی میں حکومت صرف آٹھ ماہ کی ہے اور باپ

کی وفات کے بعد وہ چودہ دن کم ایک سال زندہ رہا۔

شاہ حسین کی وفات کے ایک سو سولہ برس بعد یہ واقعہ ہوا اور اس کے بیس برس بعد یعنی ۱۱۴۴ھ میں لاہور کے مغل گورنر نواب ذکریا خان نے شاہ حسین کے مزار کے احاطہ میں ایک مسجد تعمیر کرائی اور یہ مسجد اس عقیدت کے باعث تعمیر ہوئی جو نواب ذکریا خان کو شاہ حسین سے تھی۔ دوسرے مغل بادشاہ محمد شاہ نے بھی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ جب مسجد تعمیر ہوئی تو اس کی تین محرابوں میں سے درمیانی محراب پر بخط ثلث کانسی کار برنگ آسمانی بسم اللہ و کلمہ شریف لکھا۔ شمالی محراب پر کانسی کار کتبہ پر مندرجہ ذیل اشعار ہیں۔

خواست در دورِ شاہ ملک پناہ — شاہ ہندوستاں محمد شاہ
عالم و عادل و سخیٔ زماں — در صفِ معرکہ چوں شیرِ ژیاں
زبدۂ بارگاہ او نواب — ذکریا خان صوبۂ پنجاب
بر خواہش اگرچہ جمشید است — لرزہ در تن فتادہ چوں بید است
نیک نام آں کہ نیک نامیٔ او — ہمچو بوئے گل است در ہر سو
چاہ و مسجد زخود بنا بکند — عالی و خوب و خوش نما بکند
محض بہر خدا کند ایں کار — تا نمازی شود نماز گزار
باز ہر چہ ثواب زاں آید — بسوئے بانیش شود عائد

جنوبی محراب پر بھی ویسا ہی خوشنما کتبہ کانسی کار جس میں یہ اشعار ہیں:

یا رب از فضلِ خود نگاہش دار — از شکستن تو در پناہش دار
کرد احداث مسجدِ محکم — نیز خوش دور چاہِ مستحکم
نزد درگاہِ صاحب عرفاں — واقفِ سرِ حضرت رحماں
آنکہ معروف شد بہ لال حسین — خاکِ نعلینِ اوست سرمۂ عین
کرد معمار جوں بعد تعمیر — مسجد و چاہ را نکو تعمیر

چوں ایں سجدہ گہ از پئے خاص و عام (اس سے اگلا شعر حذف ہو چکا ہے)

نیا یافت از سروری نیک نام

زتاریخ او ہر کہ جوید شمار

بداند ہزار و صد و چہل و چار

۱۱۴۴ھ

اس تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۱۴۴ھ تک شیخ حسین یا شاہ حسین، مادھو لال حسین کے نام سے معروف ہو گئے تھے۔ ان کے بارے میں علماء و مشائخ کا وہ خوف باقی نہیں رہا تھا جو حضرت طاہر بندگی کو دامن گیر رہا۔ مغل گورنر کی طرف سے حسین کو "صاحب عرفان" اور "ستر رحمان" کا واقف لکھا گیا اور ان کے پاؤں کی خاک کو آنکھوں کا سرمہ کہا گیا۔

نواب ذکریا خان کے عہد میں ہی نادر شاہ حملہ آور ہوا۔ کنہیا لال 'تاریخ لاہور' میں لکھتا ہے "جب (نادر شاہ) لاہور کے متصل پہنچا (۱۱۵۱ھ - ۳۹،۱۷ء) تو نواب ذکریا خان بہادر وصوبۂ لاہور بہ مقابلہ پیش آیا اور ایک سخت محاربے کے بعد شکست کھائی۔ اس شکست کے بعد خود نواب قلعے میں محصور ہوا، اندرونی شہر کے دروازے بند کر لئے مگر شہر کی بیرونی آبادی، جو اندرونی آبادی سے چار چند تھی، لٹنی شروع ہوئی اور نادری فوج مرگ مفاجات کی طرح شہر میں گھس آئی اور دو دستہ شہر کو لوٹنے لگی۔"

اس لوٹ مار میں شاہ حسین کے مزار سے متعلق اور شاید ان کی زندگی کے بارے میں بھی بہت سا قیمتی ریکارڈ تلف ہو گیا جو باقی بچا وہ احمد شاہ ابدالی کے عہد میں برابر ہوا۔

"سکھوں کے عہد میں ابتداً لاہور شہر اور اس کے آثار قدیمہ کو جی بھر کر لوٹا گیا اور پھر اس کی آبادی کا کچھ سامان رنجیت سنگھ کے عہد میں ہوا۔ رنجیت سنگھ کے بعد پھر وہی طوائف الملوکی جو پہلے تھی۔ نور احمد چشتی نے سکھوں کے عہد میں شاہ حسین کی درگاہ کے بارے میں لکھا ہے کہ بروز بسنت مہاراجہ صاحب بہادر کا یہ معمول تھا کہ تمام امیر و رئیس و افواج کو حکم ہو جاتا تھا کہ وردی

لباس بسنتی پہنیں۔ زین، ہودج، جھانجھائے اسلحہ وغیرہ تمام بسنتی ہوا کرتے تھے اور یہاں بمزار پُرانوار حضرت خیمہ ہائے بسنتی ایستادہ ہوا کرتے تھے اور درِ قلعہ سے تا بمزار پُرانوار دو رستہ فوج دریاں بسنتی بس جم جاتی تھی۔ اور ماسوائے اس کے ہر امیر رئیس خود مع ملازمین بسنتی پوش ہوا کرتے تھے اور رعایائے شہر زن و مرد میں سے ایسا کوئی کم بخت ہوتا ہوگا کہ پارچہ بسنتی اس روز نہ پہنتا ہوگا۔

''جب اس طرح فوج جم جاتی تو بوقت دو بجے سواری مہاراجہ کی قلعہ سے نکلتی اور تمام مخلوقات جو منتظر دیدار سرکار ہوتے تھے جب آواز توپہائے و شلک سلامی سنتے تو ہشاش بشاش ہو کر خندہ زن ہوتے۔ جب مہاراجہ کی سواری میلے میں آتی تو یہ لطف ہوتا تھا کہ اب اس کی یاد میں چشم آب ہو آتی ہے۔ کم از کم ساٹھ ستر ہاتھی اور چار پانچ سو گھوڑا با زین ہائے مرصع و تمام ڈیرہ سواران چار یاری اور دو رجنٹ پیدل اردل جلو میں ہوا کرتی تھیں اور شاہ سے گدا تک ہر ایک شخص بسنتی پوش ہوا کرتا تھا بلکہ در و دیوار بھی بسنتی نظر پڑتے تھے اور مہاراج مٹھیاں روپوں کی بھر بھر کر تصدق کرتے اور پھینکتے ہوئے تا مزار پُرانوار حضرت حسین کے پہنچتے اور بعدہ سواری سے اُتر پاپیادہ ہو، با تمام مع رؤسائے عالی مقام پیر برہنہ خانقاہ کے دروازے سے اندر جاتے تھے۔ پھر شلک سلامی کی ہوتی تھی۔۔۔۔''

پھر پورا پچھلا پہر رنگ و مستی میں گزرتا، غروب آفتاب مہاراجہ مزار پر رہتا اس کے بعد واپس قلعے میں جاتا۔۔۔۔۔ اس جشن کی خوشی میں پوری فوج کو ایک ماہ کی زائد تنخواہ (بونس) دی جاتی۔

رنجیت سنگھ کے زمانے میں معروف طوائف موراں اور اس کی والدہ نے شاہ حسین کے مزار کے احاطہ میں ایک مسجد بنوائی۔ ۱۲۷۵ھ میں بنائی گئی اس مسجد پر لکھا تھا کہ بانی مسجد موراں اور موراں بیگم کی والدہ ہے۔ موراں دوآبہ کی رہنے والی تھی۔ لاہور میں رہائش ہیرا منڈی میں تھی۔ قبر شاہ حسین کے مزار کے احاطہ میں اب تک موجود ہے۔

انگریزوں کے عہد میں جب نور احمد چشتی کنہیا لال اور محمد لطیف کے ذریعے حکمرانوں نے آثار قدیمہ کی تفصیلات تیار کرنے کے لئے کہا تو نور احمد نے شاہ حسین کے مزار کا حال لکھتے ہوئے

حکمرانوں سے سفارش کی کہ مغل بادشاہوں سے لے کر مہاراجہ رنجیت سنگھ تک سبھی حکمرانوں نے اس کی تعمیر و مرمت کا کام کیا ہے۔ اس لئے انہیں بھی اسی طرح ادھر توجہ کرنی چاہیئے جس طور مقبرہ جہانگیر کی دیکھ بھال کی جا رہی ہے۔ چشتی نے ۱۸۶۴ء میں متنبہ کر دیا تھا کہ اگر اس مکان کی طرف توجہ سرکار ہو تو موجب خوشی خاطر رعایائے پنجاب ہو گا۔

مگر یہ حقیقت ہے کہ انگریزوں کے عہد میں اس عمارت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی اور مزار اور اس سے ملحق رقبہ جو چار گھماؤں پر مشتمل تھا محدود ہو کر بمشکل ایک گھماؤں رہ گیا ہے۔ نہ مادھو کا حجرہ رہا، نہ شاہ ارزانی کا تھڑا، نہ صدر دیوان کی وہ نشانی جہاں وہ زندہ دفن ہو گیا تھا، نہ موراں کی مسجد ..... نواب ذکریا خان کی مسجد کا نقشہ بھی وہ نہیں رہا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی اس مزار پر توجہ نہ دی گئی، چنانچہ مجاور کھل کھیلتے رہے۔ جب حالات بہت ہی خراب ہونے لگے تو لاہور کی تاریخ میں پہلی بار ادیبوں، شاعروں نے شاہ حسین کو شاعر کی حیثیت سے یاد کرنے کا اہتمام کیا اور مزار کی حالت زار پر تشویش کا اظہار ہونے لگا تو محکمہ اوقاف نے مزار کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ کچھ نئی تعمیرات ہوئیں مگر آثار قدیمہ یا اصل حالت کو بڑا خراب کر دیا گیا۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ حسین کے لوح مزار پر ان کی تاریخ وفات تک غلط لکھی ہوئی ہے جو ۱۰۵۸ھ ہے حالانکہ ان کا انتقال ۱۰۰۸ھ میں ہو گیا تھا۔ تاریخ ولادت لکھی ہی نہیں گئی۔ مزار کے اندر پنجابی کے دو غلط سلط شعر ہیں ان میں سے ایک بابا فرید گنج شکر کا ہے اور دوسرا کسی نامعلوم شاعر کا۔ حسین کا ایک مصرع بھی مزار کے کسی کونے میں نظر نہیں آتا۔

نور احمد چشتی نے لکھا تھا کہ دربار کا طول اندر سے ایک سو پانچ گز اور عرض ایک سو گز ہے۔ یہاں معروف فقراء کی ستر کے قریب قبریں ہیں، اور "چار دیواری کے اندر تمام اشجار چیر ونز، نیم و کریر و برنا و سکھ چین، و شریینہ وغیرہ کھڑے ہیں۔ اگر شمار کریں تو ایک ہزار ہو گا ....."

مگر آج ایک ہزار اشجار میں سے بمشکل بیس پچیس درخت باقی ہیں۔ غیر متعلق اور غیر معروف

لوگوں کی قبریں خاصی ہیں جو قیام پاکستان کے بعد بنیں۔ صرف ایک معروف شاعر استاد دامن کی قبر ۱۹۸۴ء میں..... کہتے ہیں استاد دامن نے زندگی کا بیشتر حصہ اس مسجد کے حجرے میں گزارا۔ جہاں شاہ حسین نے حافظ ابوبکر اور شیخ بہلول دریائی سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی، مرنے کے بعد محکمہ اوقاف نے بمشکل انہیں مزار کے احاطہ میں دفن کرنے کی اجازت دی۔ استاد دامن نے ابتدائی زندگی باغبانپورہ میں گزاری تھی۔

کرامات

مدینہ اور لاہور، دردِ لا دوا، مالِ دنیا
بوسہ، آدھی رات کا سورج، بارانِ رحمت
اولاد، جلال و جمال

محمد پیر سے بھی پہلے دارا شکوہ نے اپنی کتاب حسنات العارفین (شطحیات) میں جو ۱۰۶۴ھ میں یعنی "حقیقت الفقراء" سے سات برس پہلے مکمل ہوئی دارا شکوہ نے لکھا ہے۔۔۔۔ "اس نے طریقِ ملامت کو دہل اور نقارہ کی چوٹ ظاہر کیا اور متاخرین میں اس کی طرح کسی نے طریقِ ملامت پامال نہیں کیا۔ اہلِ ملامت کا استاد تھا۔۔۔۔ اس کا عجب مشرب تھا۔ صبح سے شام تک گانے والوں اور بجانے والوں کے ساتھ۔ تمام شہر میں داڑھی منڈا کر مست پھرا کرتا تھا اور کوئی اس پر غالب نہ ہوتا تھا۔ خوارق اور کرامات اس سے بکثرت ظاہر ہوئیں۔ قرآن کا حافظ تھا۔ تمام دن میں ایک مرتبہ قرآن ختم کر لیا کرتا تھا۔۔۔۔ نیز ملا عبدالحکیم (سیالکوٹی) نے بیان کیا کہ میں اس کے پاس بیٹھا تھا ایک شخص اس کے پاس آیا اور کہا کہ میری ایک حاجت ہے اور وہ بر نہیں آتی۔ اس کو ایک گالی دی کہ جا کر اس پر پیشاب کر۔ اس نے جب ایسا کیا اس کی حاجت پوری ہو گئی اس قسم کی باتیں اس کی بہت ہیں۔"

محمد پیر نے جو خود مادھو لال کا مرید تھا اور جس نے بہت سی باتیں اپنے پیر سے ہی سُنی ہوں گی اور یقیناً ان میں سے کئی باتیں اس وقت تک شہر لاہور میں بازگشت بن چکی ہوں گی جب محمد

پیر شاہ حسین کے سوانح حیات لکھ رہا تھا، خوارق اور کرامات کے بارے میں دارا شکوہ بھی لکھتا ہے کہ "اس سے بکثرت ظاہر ہوئیں"۔ شاہ حسین کے اس کمال کی تصدیق خود اس عہد کے نامور اور جید عالم ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی نے کی جو جوانی میں مرید ہونے کے لئے شاہ حسین کے پاس حاضر ہوئے تھے۔۔۔۔

بیک وقت مدینہ اور لاہور میں

محمد پیر بیان کرتا ہے کہ ایک شخص حاجی یعقوب بہت دیر تک مکہ اور مدینہ میں رہا۔ مدینہ میں اس نے رسول اکرمؐ کے مزار پر ایک نوجوان کو دیکھا کہ دن رات عبادت میں مصروف ہے، تمام دینی فرائض کمال عقیدت اور اہتمام سے ادا کرتا ہے۔ دونوں میں آشنائی ہوئی۔ حج کے دن آئے تو دونوں حج کرنے کے لئے مکہ پہنچے۔ یوں ان دونوں میں کئی سالوں تک آشنائی رہی۔ حالات کے الٹ پھیر کے سبب حاجی یعقوب لاہور آ گیا۔ یہ شہر اور اس کی عمارات اس کو بڑی پسند آئیں۔ ایک روز وہ سیر کرنے کے لئے نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ عین سر بازار وہی شخص کھڑا ہے جو مکے اور مدینے میں اس کا ساتھی تھا، مگر یہ شخص جام اور صراحی اور شاہد و دوستاں کے ساتھ سر بازار رقص کرتا جاتا ہے۔ حاجی یعقوب کی حیرت کی حد نہ رہی، سوچا کوئی اور ہو گا مگر کئی سالوں کی آشنائی کی بنا پر اسے یقین سا تھا کہ وہی شخص ہے۔ تصدیق کے لئے اس نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون جواں مرد ہے جس نے داڑھی تراش رکھی ہے، ڈھول کی تال پر رقص کرتا ہے اور جس نے ایمان اور دین کے چہرے کو چھیل دیا ہے۔ افسوس یہ اپنے خالق کے قہر سے بھی نہیں ڈرتا۔

حاجی یعقوب کا جواب سن کر اس شخص نے کہا کہ اس کا نام حسین ہے وہ خدا کا عاشق اور رسولؐ کا فقیر ہے۔ کون و مکان سے آزاد ہے، شراب پیتا ہے اور رقص کرتا ہے اور اسی

عمل میں اس نے حقیقت کو تلاش کر لیا ہے۔ اگر سچ پوچھو تو وہ مردِ خدا ہے۔

حاجی یعقوب نے لاحول پڑھی کہ کہاں شراب اور کہاں خدا کی تلاش، اہل حق تو شراب و شاہد سے بیزار ہوتے ہیں۔ اسے مردِ حق کون کہے گا۔

حاجی یعقوب کے ان تبصروں کے بعد اس شخص نے حاجی سے کہا کہ بہتر ہے کہ وہ یہ سوال خود شاہ حسین ہی سے کرے۔ چنانچہ حاجی یعقوب آگے بڑھا، معذرت کی اور کہا اگر میں غلطی نہیں کرتا تو تُو مشرب میں میرے ساتھ تھا سچ سچ بتا تو مجھ سے پہلے لاہور کیسے پہنچ گیا۔ ہم دونوں برسوں مکّہ اور مدینہ میں اکٹھے رہے ہیں، ہم نے اپنے سروں میں مدینے کی خاک ڈالی، حج کے لئے ہم ایک ساتھ مدینہ سے مکّہ تک سفر کیا کرتے تھے۔ مناسک حج ساتھ ساتھ ادا کرتے تھے تو شرع پیغمبر کا زبردست پابند تھا، اور وہاں تیرے مالی حالات بھی بہت اچھے تھے لیکن اب تو نے یہ کیا حال بنا لیا ہے۔

شاہ حسین نے حاجی یعقوب کی بات سُنی تو مسکرائے، کیا میری باہر کی صورت پر نہ جا، اگر نظر رکھتا ہے تو اندر کی صورت کو دیکھ، میں جو کچھ کرتا ہوں، اسی خدائے برتر کے بندے کی حیثیت سے کرتا ہوں اور اگر پھر بھی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی تو پھر اپنی آنکھیں بند کر اور خود ہی حقیقت حال جان لے۔

حاجی یعقوب نے آنکھیں بند کیں اور دیکھا کہ روضۂ رسولؐ کے دروازے پر شاہ حسین شرعی لباس میں بیٹھے ہیں۔ حاجی یعقوب نے آنکھیں کھول دیں اور شاہ حسین کے سر پہ پاؤں رکھ کر سوال کیا کہ حسین یہ سارا قصہ کیا ہے۔ میں نے اور تو نے برسوں ساتھ گزارے ہیں اور مکّہ اور مدینہ میں گزارے ہیں وہاں تو نے شریعت اور عقیدت کے سب ضابطوں کی پابندی کی اور یہاں یہ حال کہ مستی میں رقص کرتا ہے، شرع کی کھلے بندوں تذلیل کرتا ہے۔ تو یہاں اس حال میں اور مدینہ میں دوسرے حال میں موجود ہے۔

شاہ حسین نے کہا کہ اے یعقوب تجھے یہ راز فاش نہیں کرنا چاہیئے تھا اور آئندہ بھی

تو یہ بھید کسی کو نہیں بتائے گا اور نہ مجھ سے سوال کرے گا۔ پھر شاہ حسین نے باآوازِ بلند کہا کہ میں کب لاہور سے یثرب گیا اور کب وہاں سے لاہور آیا، میں نے کب مکہ میں حج ادا کیا؟ کعبہ کا حج کیا اور میری یہ بے راہ روی کہاں۔ مجھے کیا خبر حریم کعبہ کیا ہے، میں تو ہمیشہ حرص و ہوا میں گرفتار رہا ہوں۔

یہ کہہ کر حسین اور اُس کے ساتھی اپنے حال میں مست گزر گئے۔ مگر ان کے جانے کے بعد حاجی یعقوب نے ارد گرد کے لوگوں کو آواز دے کر پاس بُلایا اور کہا کہ یہ شخص جو رندوں کے ساتھ مست جا رہا ہے یہ میرے ساتھ روضۂ رسول پر تھا۔ میں نے اور اس نے اکٹھے حج کیے اور پھر جب میں ہند آنے کے لئے مکے سے عجم کی طرف چلا تو اسے حرم کے اندر چھوڑ آیا تھا۔ جب میں لاہور میں پہنچا تو آج اسے اس حال میں دیکھا یہ مجھ سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا۔ اور جب میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا حال ہے تو مجھے شناخت کرنے سے انکار کر گیا۔ حالانکہ اس کا باطن اب بھی یثرب و بطحا میں ہے۔ صرف ظاہری طور پر وہ لاہور میں رہتا ہے۔ یہ شخص دنیا والوں کی نظر میں ایک فاسق ہے مگر اصلاً وہ خدا سے پیوست ہو چکا ہے۔ اس نے باہر ایک دوسرا کھیل تماشہ رچا رکھا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ لوگ اس کی اصل حقیقت سے واقف ہوں۔ وہ دنیا داروں سے دور رہنے کے لئے یہ حلیہ اختیار کئے ہوئے ہے۔

حاجی یعقوب اپنی چشم دید کتھا سنانے کے بعد حسین کی تلاش میں چل پڑا۔ مگر وہ کئی روز تک حسین کا کوئی سراغ نہ لگا سکا۔ دراصل شاہ حسین کو حاجی یعقوب کا رویّہ پسند نہ آیا۔ خاص طور پر جب حاجی یعقوب نے سرِ عام لوگوں کو اصلی بات بتا دی تو شاہ حسین کو یہ اچھا نہیں لگا کہ جس راز کو وہ خود سینے میں چھپائے پھرتے تھے اس کو یوں فاش کر دیا جائے۔ شاہ حسین نے تو دنیا داروں کو خود سے دور رکھنے کے لئے بہروپ بھرے تھے مگر حاجی یعقوب نے اس بہروپ میں سے اصل روپ لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔۔۔۔۔ حاجی یعقوب نے شاہ حسین کی بہت تلاش کی کہ اسے مرید بنا لیا جائے مگر حسین حاجی یعقوب پر بہت ناراض تھے۔ وہ حاجی یعقوب

کو دوبارہ لاہور شہر میں نہیں ملے۔ آخر ش حاجی یعقوب دیار ہند سے پھر واپس مکہ و مدینہ گیا۔ کہتے ہیں کہ وہاں شاہ حسین موجود تھے اور وہاں حاجی یعقوب نے ان سے ملاقات کی۔ ان کے قدموں میں گر پڑا اور بہت معافی مانگی۔

دردِ لا دوا

اس زمانے میں لاہور میں ایک شخص مُلا سعید خان تھا، بہت پڑھا لکھا، عالم فاضل اور غالباً اس کا تعلق اشرافیہ سے تھا۔ اس کے کان میں درد ہوا، شہر کے نامی گرامی حکیموں، ویدوں سے علاج کرایا کوئی فائدہ نہ ہوا کہ درد دوا کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ سعید خان بہت عاجز آ گیا، زندگی سے بیزاری بڑھ گئی۔ ایسی کیفیت میں کسی نے کہا کہ وہ شاہ حسین کے پاس جائے وہ یقیناً اس درد کا کوئی درماں کر دیں گے مگر عالم فاضل مُلا سعید خان کا ایک شرابی، آوارہ کے پاس جانا آسان کام نہ تھا اس نے کہا کہ وہ شرابی کیا میرے دکھ کی دوا کرے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کہہ کر مُلا سعید کی شان تو باقی رہ گئی مگر درد نے اس کو بے حال کرنا شروع کر دیا۔ جب برداشت کی حد سے باہر ہوا تو پھر مُلا سعید نے شرعی حیلہ اختیار کیا کہ جان بچانے کے واسطے بدعت بھی روا ہے۔ حرام موت مرنے سے بہتر ہے کہ کسی کافر سے بھی مدد لے لی جائے۔ چونکہ حسین کسی کے بلاوے پر کسی کے پاس نہیں جاتے تھے حتےٰ کہ بادشاہ کے بلاوے پر بھی جانے کو کبھی تیار نہ ہوئے اس لئے مُلا سعید کو ان کے ہاں حاضری دینا پڑی۔ حسین اس وقت بوریا نشین تھے۔ حاجی سعید کو اس حال میں دیکھا تو تبسم کیا اور پوچھا کہ اسے کیا تکلیف ہے کہ اس کا چہرہ اترا ہوا اور حال بے حال ہے۔ مُلا سعید نے کہا کان میں شدید درد ہے، بہت علاج کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا، درد حد سے باہر ہوا جاتا ہے اسے دور کرنے کا کوئی چارہ کیجئے۔

قریب ہی کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا، عام موٹا سا ردی کاغذ، حسین نے سعید سے کہا

کہ وہ یہ کاغذ اٹھائے اور کان میں رکھ لے مگر مُلّا سعید اس عہد کا دانشمند تھا اس لئے اسے حسین کی اس بات پر حیرت ہوئی کہ یہ معمولی کاغذ اس کے درد کو کیسے دور کرے گا۔ اس نے حسین سے کہا کہ کاغذ سے علاج نہیں ہو گا کیونکہ وہ تو انتہائی ریشمی کاغذ (کاغذ حریر) بھی کان میں رکھ کر دیکھ چکا ہے مگر اس سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ حسین نے پھر کہا کہ کاغذ کوئی چیز نہیں ہوتا، نہ اس میں کوئی تاثیر ہوتی ہے مگر میں جو کہہ رہا ہوں تو یہ کاغذ اٹھا اور اپنے کان میں رکھ لے۔

مُلّا سعید نے شاہ حسین کی زور سے کہی ہوئی بات سُن کر کاغذ اُٹھا کر کان میں رکھ لیا اور فوراً ہی کان کا درد غائب ہو گیا۔ مُلّا سعید جو انتہائی بیزاری اور بدحالی کی صورت میں آیا تھا کھلکھلا اُٹھا، اسے حیرت بھی تھی کہ جس درد کا علاج شہر لاہور کے بڑے بڑے وید اور حکیم نہ کر سکے کس طور کاغذ کے معمولی پُرزے نے دور کر دیا۔ مُلّا سعید نے حسین سے کہا کہ بخدا میں نے ایسا علاج نہیں دیکھا اور میرا یقین ہے کہ کاغذ میں کوئی تاثیر نہیں، ساری تاثیر آپ کے کلام میں ہے۔ مُلّا سعید اس کے بعد گھر پلٹ گیا۔ اور جب تک زندہ رہا شاہ حسین کی محبّت اور عقیدت کا دم بھرتا رہا... جب بھی مُلّا سعید کو کوئی مسئلہ پیش آتا وہ حسین کے پاس حاضر ہو جاتا حتٰی کہ مُلّا سعید کو جو علمی، ادبی اور مذہبی مسئلے بھی پیش آتے وہ ان کے حل کے لئے حسین کے پاس آتا اور حسین اس کے دل کے ہر خلل کو دور کر دیتے۔ مُلّا سعید کی نظر میں حسین کو ازل سے یہ علم حاصل ہوا تھا وہ اوّل و آخر سے پوری طرح آگاہ تھا:

زانکہ علم لدّنی از امکاں　　　بر دلِ او تمام بود عیاں

فقیروں کا مالِ دنیا سے کوئی تعلق نہیں

شاہ حسین کے عہد میں لاہور شہر میں ایک کیمیا گر یعقوب رہا کرتا تھا، طویل عرصے سے

تجربات اور محنت کے بعد وہ سونا بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ ایک معروف آدمی تھا اور اس فن میں مشہور تھا، ایک بار اس نے ایک تولہ اکسیر بنایا اور شاہ حسین کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اس کی خواہش تھی کہ حسین اپنی کرامت سے اس میں کمی بیشی کر دیں۔ اس نے کاغذ میں لپٹا یہ اکسیر شاہ حسین کے سامنے رکھا۔ شاہ حسین نے پوچھا "کیا چیز ہے"۔ کہا کہ اکسیر بنایا ہے اور اگر میں چاہوں تو اس سے سوگنا سونا بنا سکتا ہوں۔ شاہ حسین نے دیکھا کہ وہ شخص اپنے اس کمال پر بڑا فخر کر رہا ہے اور اسے اپنی کاریگری پر بڑا ناز ہے گویا اس نے بہت بڑا معرکہ مارا ہے حسین نے اس کے اس فخر پر لعنت بھیجی اور کہا کہ تو نے یہ کیمیا بنانے کے لئے کیا کیا کام نہیں کئے۔ کبھی سر بازار اور کبھی سرِ صحرا پریشان ہوا ہے، تو نے بازار سے مادہ خریدا، اس کا کشتہ مارا، جنگلوں میں جڑی بوٹیوں کی تلاش میں سرگرداں رہا، خشک و تر دوائیں جمع کیں، ان کو کوٹا، پیسا، کبھی گیلا کیا کبھی انہیں خشک کر دیا، کبھی اس بوٹی کا عرق نکالا اور کبھی اس جڑ کا ست کیا۔ پھر خاص انداز سے برتن بنائے، آگ جلائی، طرح طرح سے ان کو گلایا، پکایا، کبھی ٹھنڈا کیا، کبھی گرم، جب تو اس عمل سے گزر رہا تھا تو تجھے خوف ہوا کہ کہیں چور نہ آجائیں اور جو کچھ تو بنا رہا ہے یا بنا چکا ہے اُڑا نہ لے جائیں۔ اس لئے تو نے دیا بجھا کر بے نور گھر میں اکسیر سازی کا عمل جاری رکھا۔۔۔۔ اور پھر اچانک تو نے اکسیر بنا لیا، جس سے سونا بنانا آسان ہوگیا۔۔۔۔ اور پھر تو اسے یہاں ہمارے پاس لے آیا، ہم فقیروں کو نہ اکسیر بنانے سے واسطہ ہے نہ سونے سے۔ ہمارے لئے یہ کار بیکار ہے مگر تو یہ بنا کر ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم تمہاری تعریف کریں اور اس اکسیر کے ذریعے سونا بنانے کی کوشش کی کامیابی کے لئے دعا کریں۔۔۔۔ تو نے اکسیر اور سونے کے چکر میں کیا کیا بھاڑ جھونکے ہیں اپنی جان کو عذاب میں ڈالا ہے۔ تجھے معلوم نہیں کہ ہم فقیروں کا راستہ دنیا داروں سے جدا ہے ہمارے لئے اس قسم کا کام گناہِ عظیم ہے۔ فقیروں کو اس قسم کا گناہ کرنے کا اختیار نہیں ہے ورنہ وہ اپنی ایک نگاہ سے ہی ساری مٹی کو سونا بنا کر رکھ دیں۔

شاہ حسین یہ کہہ کر مجلس سے اُٹھ کھڑے ہوئے، اکسیر ساز یعقوب کو ساتھ لیا اور ایک گوشے

میں جا کر پیشاب کیا۔ جہاں جہاں پیشاب پہنچا وہاں وہاں مٹی سنہری ہو گئی، حسین نے یعقوب سے کہا کہ یہ سونا ہے اسے اٹھالے۔۔۔۔ تو اب یہ خیال کرے گا کہ میرے پاس بھی کیمیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس خدا کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس لئے اس کیمیا سازی کو چھوڑ کر خدا کی تلاش کر۔ اگر تجھے خدا مل گیا تو جان کہ تجھے کیمیا حاصل ہو گیا۔۔۔۔ حسین کی کرامت اور ہدایت پر اکسیر ساز یعقوب کیمیا سازی سے تائب ہو گیا اور حسین کے دست پر بیعت کر لی اور فقر کے راستے پر چل پڑا۔ اکسیر ساز یعقوب بھی شاہ حسین کے عقیدت مندوں کے حلقہ میں داخل ہو گیا۔ (اس قسم کی کرامت پنجابی کے معروف شاعر حضرت سلطان باہو سے بھی منسوب ہے)

تپتے لوہے کا بوسہ

شاہ حسین کو شہر سے نکل کر کھیتوں، دریاؤں اور دیہات کی طرف سیر کا بہت شوق تھا، وہ اکثر اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہر سے باہر چلے جاتے مگر وہاں قیام نہ کرتے گھوم پھر کر شہر کو لوٹ آتے۔ شہر میں بھی بقول دارا شکوہ وہ ناچتے، گاتے ادھر ادھر پھرتے رہتے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مستقل اڈہ کہیں نہ تھا، اس لئے نہ شہر کا کوتوال ملک علی انہیں گرفتار کر سکا اور نہ ہی مکے مدینے کا ان کا ساتھی حاجی یعقوب ان کو تلاش بسیار کے باوجود شہر میں پا سکا۔ اسی طرح مخدوم الملک قاضی عبداللہ سلطانپوری نے جب چاہا کہ حسین کو ان کی خدمت میں پکڑ کر لایا جائے تو شاہی کارندے انہیں ڈھونڈنے یا پکڑنے میں ناکام ہوئے۔

شاہ حسین ایک روز بیرون شہر کی سیر کر کے آئے اس سیر میں ایک مقلد ان کے ساتھ ہو لیا۔ اس مقلد کو شاہ حسین کے طریق کار پر اعتراض تھا اور شرعی اعتبار سے غالباً وہ ان کو زچ کر رہا تھا۔۔۔ جب حسین اور ان کے ساتھی شہر میں آئے اور شہر میں حسب معمول دھوم مچاتے پھرے تب بھی یہ مقلد ان کے ساتھ تھا۔ اور ان کے غیر مقلد ہونے پر اعتراض کر رہا تھا، آج کے دور کی طرح لازمی امر ہے

کہ اس دور میں بھی ہم خیال طائفے اختلاف رکھنے والوں کو طرح طرح سے تنگ کرتے ہوں گے۔
عین ممکن ہے کہ شاہ حسین کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا ہو جس سے تنگ آ کر انہوں نے اس مقلد کو سبق سکھانے کا ارادہ کر لیا۔۔۔۔ جب حسین نے یہ ارادہ کیا عین اس وقت ان کے قریب سے ایک خوب صورت جوان عورت گزر رہی تھی، شاہ حسین نے اس عورت اور عورت نے شاہ حسین کو دیکھا۔ شاہ حسین نے اس مقلد کی موجودگی میں اس عورت کے ہونٹوں پر بوسہ دیا۔ اس کے رخساروں کو چوما۔ مقلد حیران و ششدر رہ گیا۔ اس کے اسی حیرت کے عالم میں حسین نے ساتھ ہی ایک لوہار کی دوکان پر تپے ہوئے لوہے کو دیکھا اور اٹھا لیا حسین نے اسی دم اس سُرخ لوہے کو چوم لیا۔۔۔۔ اور پھر مقلد سے کہا کہ اب اس کی باری ہے، وہ تقلید کرے۔ پہلے اس عورت کے لبوں کو چومے اور اس کے بعد اس تپے ہوئے لوہے کو اس طرح بوسہ دے جس طرح حسین نے بوسہ دیا ہے۔

باز پس گفت آں مقلد را	بے حیائے خبیث ملحد را
کہ بتقلیدِ من لب آن زن	زود بوسید از ہوس، چوں من
ہم بدیں آہنے کہ بوسیدم	تو کنوں بوسہ دہ بہ تقلیدم
از کفِ من بگیر در کفِ خویش	ہم چوں من ۔۔۔ بر کف خویش
تف بایں و دینت اے گمراہ	کہ بتقلید افتے اندر چاہ

مقلد نے جب یہ سب کچھ دیکھا اور سُنا تو شاہ حسین کی اس عملی دلیل سے حیرت زدہ رہ گیا۔ اور فوراً ہی حسین کے پاؤں پر سر رکھ کر معافی کا خواستگار ہوا۔ حسین نے مقلد سے گفتگو کرنے کے بعد دوبارہ تپے ہوئے لوہے کو چوما اور پھر اسے لوہار کو واپس دے دیا۔

تا نباشی موحد از توحید دعوےٰ باطل است از تقلید

(حضرت موسےٰ آہن گرسے بھی اسی نوعیت کی کرامت منسوب ہے۔ انہوں نے تپی ہوئی سلائیاں آنکھوں میں پھیر لی تھیں)